ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

سنسکرت، پالی، عربی اور فارسی کے مصنفین کو پریذیڈنٹ ایوارڈ تقسیم کرنے کے لیے منعقدہ تقریب کی ایک تصویر جس میں صدر جمہوریہ ہند شریمتی پرتبھا پاٹل،
وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل شریمتی پورن دیشوری، ڈاکٹر علی جاوید اور پروگرام شروع کرنے کی اجازت لیتے ہوئے جناب آر پی اگروال اور دیگر شرکا کو دیکھا جا سکتا ہے۔

Annual Subscription

	Surface Mail	Air Mail
Pakistan	Rs. 192	480
Nepal	Rs. 300	588
BenglaDesh	Rs. 132	420
Rest of World	Rs. 300	684

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

مہاراشٹر،کوکن کے شہر رتنا گری میں منعقد سیمینار ''اردو کا سیکولر مزاج'' کی ایک نشست میں (بائیں سے) ڈاکٹر اے۔جی۔خان، اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر تلاوت علی، پروفیسر عتیق اللہ، جناب ذوالفقار حسین، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، جناب بشر نواز اور ڈاکٹر قاسم امام۔

رتنا گری میں ''اردو کا سیکولر مزاج'' کے موضوع پر منعقد سیمینار کا افتتاح جناب ٹھاکر دیسائی کے ہاتھوں ہوا۔
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے کارگزار صدر پروفیسر عبدالستار دلوی شمع روشن کرتے ہوئے۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔9، ستمبر 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون:26103381, 26103938
26179657 فیکس:26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم نئی دہلی۔110066
فون:26108746, 26169416

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون:040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 3

زبان اور تعلیم
● کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں .... شمس الرحمن فاروقی 4
● اردو لفظیات پر انقلاب 1857 کے اثرات .... علی رفاد فتیحی 13
● اردو زبان کی تدریس میں ہمزہ کا تعین .... انیس چشتی 16

ادب
● سرسید کا تاریخی شعور .... آفتاب احمد آفاقی 18
● مثنوی کی مضمون نگاری .... محمد نعمان خاں 22
● نشاط آبلہ پائی .... حبیب الرحمن چغتائی 27
● کربلائی اور شخصی مرثیے .... درخشاں زریں 29
● چیلیں (افسانہ) .... بھیشم ساہنی/خورشید عالم 32

ماحولیات اور سائنس
● صوتی آلودگی اور ہماری ذمے داریاں .... اقبال محی الدین 36
● خلائی سفر قدم بہ قدم .... محمد عبداللطیف 38

کیریئر
● کمپیوٹر سائنس میں کیریئر .... کاشف غزالی 40
● صحافت ایک پرکشش کیریئر .... فاروق احمد درویش پوری 42

روبرو
● علقمہ شبلی سے بات چیت .... محمد افضل خاں 44

ہماری مطبوعات سے
● چودھری محمد علی ردولوی .... صلاح الدین احمد 46
● کمان اور زخم .... فضیل جعفری 52

اردو خبرنامہ .... ادارہ 58

تبصرہ و تعارف
● آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح .... وسیم اقبال 73
● اندر سبھا کی روایت .... آصف اقبال ....
● فکر و تحقیق (سہ ماہی) .... سرفراز جاوید ....
● منثورات بنگالہ .... ظفر اللہ انصاری ....
● میں کوئی اور ہوں .... خواجہ اکرام ....
● فکر و فنکار .... منتظر قائمی ....

بچوں کا گوشہ
● کمپیوٹر (نظم) .... ارشد عبدالحمید 78
● چھتری کی قیمت .... نذیر احمد یوسفی 79

آپ کی بات

■ قاضی محمد ایوب، شاہی اک مینارہ مسجد، جودھپور - 342001

"اردو دنیا" ماہ اگست 2008 کے شمارے کے شروعاتی صفحات "آپ کی بات" سے ظاہر ہوتا ہے کہ قارئین کتنی دلچسپی اور باریکی سے رسالے کو پڑھتے ہیں۔ اسی شمارے میں "ہماری بات" میں زمانہ حال کے حالات، لوگوں کی خود بینی، خود غرضی اور چاروں طرف پھیلی آپا دھاپی پر مشتمل لوگوں کی زندگی پر بھرپور تبصرہ ہے۔

■ سرفراز جاوید، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-7

"اردو دنیا" اگست 2008 کا شمارہ موصول ہوا، شکریہ۔ اس شمارے میں ڈاکٹر سرورالہدیٰ کا مضمون "محمود ایاز اور جدیدیت" شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ مضمون بہت اہم ہے کہ محمود ایاز کو نئی نسل تقریباً بھولتی جارہی ہے۔ مضمون میں ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے لکھا ہے: "ترقی پسندی سے نپٹنے کا آسان طریقہ یہ سمجھا گیا کہ علی سردار جعفری اور محمد حسن کی خبر لی جائے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس عمل میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جن کی ذہنی سطح نہایت پست ہے اور جو مجاز مرسل کی تفہیم سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

اس اقتباس میں مضمون نگار کا اشارہ کس طرف ہے میں سمجھ نہیں سکا۔ مضمون نگار سے یہ درخواست ہے کہ وہ اس کی وضاحت کریں تاکہ اس عبارت کا ابہام رفع ہوجائے۔

■ محمد اسلم بن طریق اللہ، دیا چودی، پوسٹ سربھنگا، ضلع گڈا، جھارکھنڈ

ماہنامہ "اردو دنیا" تقریباً پانچ چھ مہینے سے زیر مطالعہ ہے۔ زبان و تعلیم، ادب، سائنس، ٹیکنالوجی، کیریئر وغیرہ موضوعات پر مشتمل تمام مضامین اپنے اندر معلومات کے بیش بہا موتی چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں اردو ادب کا ایک معمولی قاری ہوں۔ اس وقت جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں زیر تعلیم ہوں۔ ابتدا ہی سے ہم جیسے طالب علموں کا اردو زبان سے ٹوٹا پھوٹا تعلق رہتا ہے۔ مگر یہ کمزور رشتہ ایک مضبوط اور مستحکم رشتے میں تبدیل ہوجائے ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں اس کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش نہ ذاتی طور پر کی جاتی ہے اور نہ ہی اساتذہ کی جانب سے اس کی ترغیب دی جاتی ہے۔ (الا ماشاء اللہ سوائے چند استادوں کے) یہ تو میری خوش بختی ہے کہ اردو زبان و ادب کے حصول کا شوق وجذبہ میرے دل میں پیدا ہوا اور انشاء اللہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

خیر ماہنامہ "اردو دنیا" تو قریبی اسٹال سے بآسانی مل رہا ہے البتہ سہ ماہی "فکر و تحقیق" کوشش کے باوجود نہ مل سکا۔ لہٰذا ایک سال کے لیے بذریعہ منی آرڈر مبلغ سو روپے ارسال کر رہا ہوں۔ یہ جریدہ جاری کرنے کی زحمت کریں۔

■ شبستاں شاہ امروز، پرتاپ گڑھ

"اردو دنیا" سے میرا تعارف ہوا تو لگا کہ یہی ایک ایسی میگزین ہے جو اردو زبان کی اصل معنی میں خدمت انجام دے رہی ہے۔ اردو سے میرا لگاؤ علی گڑھ سے شروع ہوا جہاں سے میں نے .B.Sc کیا۔ دراصل میرا ٹریک سائنس تھا اس لیے اردو میں کام کم کرسکی۔ اس کے بعد .M.Sc پھر .B.Ed دوسری جگہوں سے کیا۔ لیکن شوق پھر شوق ہے اردو میں لکھنے کے شوق نے .M.A کروایا اردو سے۔ اب تو پانچ بچے ہیں اور میں گھر داری میں ہی جٹی ہوں لیکن شوق اور علم کے ذوق کی تشنگی کبھی کبھی بیکل کرتی ہے تو قلم اٹھ جاتا ہے اور شاعری سے دو دو ہاتھ ہوجاتے ہیں۔

■ آفاق فاخری، جلال پور، امبیڈکر نگر، یوپی

"اردو دنیا" پابندی کے ساتھ زیر مطالعہ رہا کرتا ہے۔ واقعتاً یہ اپنی نوعیت کا منفرد اور ممتاز رسالہ ہے۔ مشمولات معیاری، وقیع اور پُر از معلومات ہوتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے اردو کی ترویج و ترقی کے جو کام ہورہے ہیں وہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوئے۔

■ رضوان خان، شیخ سرائے، سیتاپور - 261001

"اردو دنیا" بابت ماہ جون 2008 باصرہ نواز ہوا۔ گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی بے شمار خوبیوں سے آراستہ ہے۔ "آپ کی بات"، "ہماری بات"، "اردو خبر نامہ" جیسے مستقل کالموں کے علاوہ دیگر مشمولات بھی انتہائی وقیع اور قابل قدر ہیں۔ بیشک "اردو دنیا" جدید تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے منعقد ہونے والے سیمینار "جنگ آزادی میں بہار و بنگال کا حصہ اور اردو زبان و ادب" سے متعلق رپورٹ اور تصاویر شائع کرکے آپ نے ایک اچھا کام کیا۔ بلاشبہ اس قسم کے سیمینار کا انعقاد اپنے آپ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے یہ بھی بجا فرمایا کہ بہار میں نامساعد حالات کے باوجود اردو نے ترقی کی منازل طے کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ہندوستان کے عظیم سائنسدانوں اور اردو سے وابستہ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتگاں پر لکھے گئے مضامین بڑے دلچسپ اور اہم ہیں۔ "اردو دنیا" کے تمام اراکین کو بزم اردو سیتاپور کی جانب سے نیک خواہشات کا تحفہ پیش ہے۔

■ شیخ عبداللہ، بھارت نگر، آکولہ نمبر-3 (ایم۔ایس)

"اردو دنیا" سرورق سے لے کر آخری صفحے تک جاذب نظر ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جسے آدھی دنیا جانتی اور بولتی ہے۔ ادار یہ بے حد پسند آیا۔ معلوماتی مضامین میں اضافہ کریں تو اچھا ہوگا۔

□□□

ہماری بات

اگست میں ہمارے ملک کو آزاد ہوئے 61 سال ہو گئے۔ قوموں کی زندگی میں یہ مدت ویسے تو کچھ زیادہ نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ ایک نوآزاد ملک کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے کے لیے ناکافی سمجھی جائے۔

بعض کمیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہندوستان نے اس مختصر مدت میں کئی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ سب سے اہم کامیابی ملک میں ایک جمہوری اور سیکولر آئین کا نفاذ ہے جو گروہی مفادات کی بجائے قومی مفادات کو ملحوظ رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور جس میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ حسب ضرورت کچھ ترمیمات کی جاسکیں یا نئی دفعات بڑھائی جاسکیں۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ یا اس سے کچھ آگے پیچھے ایشیا اور افریقہ کے کچھ اور ملک بھی آزاد ہوئے تھے اور برصغیر میں ایک نیا ملک بھی پاکستان کے نام سے وجود میں آیا تھا لیکن یہ ملک آزادی حاصل کرنے کے باوجود آزادی کی برکتوں سے بہرہ ور نہ ہوسکے۔ وہاں جمہوری حکومتوں کو وہ استحکام حاصل نہ ہوسکا جو ان نوآزاد ممالک کی تعمیر وترقی کے لیے ضروری تھا۔ وقفے وقفے سے وہاں فوجی آمرانہ نظام قائم ہوتے رہے جنھوں نے جمہوری اداروں کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ سیاسی گھٹن اور جمہوری قدروں کی پامالی کے نتیجے میں پاکستان دو ٹکڑوں میں بٹ گیا اور ایک نئی مملکت بنگلہ دیش کے نام سے وجود میں آئی لیکن جمہوری نظام وہاں بھی نہیں پنپ سکا۔

جہاں تک اقتصادی ترقی کا تعلق ہے، کہا جاتا ہے کہ ایشیائی ملکوں میں چین سب سے آگے ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ پیش رفت اس نے عام شہریوں کی آزادی سلب کر کے حاصل کی ہے جس کا ردِعمل بھی اب شروع ہو چکا ہے اور نئی نسلیں موجودہ نظام میں گھٹن محسوس کر رہی ہیں۔ ممکن ہے وہاں کے نوجوانوں میں سر اٹھانے والی بے چینی اور بے اطمینانی کے پیچھے اس بدنام زمانہ بین الاقوامی خفیہ تنظیم کی ریشہ دوانیوں کا بھی کچھ دخل ہو جو اس وقت پوری دنیا میں تخریب وتشدد کو ہوا دینے والی سب سے بڑی طاقت ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جاسکتا کہ آزادانہ زندگی کی امنگ ہر آدمی کی سرشت میں شامل ہے اور نوجوانوں میں تو یہ امنگ کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے۔

ہندوستان اس اعتبار سے ایشیا کا ایک مثالی ملک ہے کہ اس کے شہریوں کو وہ تمام آزادیاں حاصل ہیں جو ایک آزاد ملک کے شہریوں کو حاصل ہونی چاہئیں۔ ان میں سب سے اہم اظہار رائے کی آزادی ہے جو ہمیں ملک میں اپنی پسند کی حکومتیں قائم کرنے کا حق بھی دیتی ہے۔ ہندوستان میں متعدد سیاسی جماعتیں ہیں جو ووٹروں کو اپنا ہموا بنا کر مسند اقتدار تک پہنچنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں چنانچہ آزادی کے بعد سے اب تک مرکز ہو یا ریاستیں کہیں بھی کسی ایک سیاسی جماعت کی اجارہ داری قائم نہیں رہی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر سیاسی جماعت کو آزمانے کا موقع رائے دہندگان کو ملتا رہا اور ان کی کارگزاریاں ان کے سامنے آتی رہیں۔ چنانچہ ہندوستان کا ووٹر پچھلے پچاس ساٹھ سال کے مقابلے میں اب زیادہ باخبر اور باشعور ہے۔

لیکن آزادی اپنے ساتھ کچھ ذمے داریاں بھی لاتی ہے۔ اگر ان ذمے داریوں کو نہ سمجھا جائے اور انھیں پورا نہ کیا جائے تو جمہوری عمل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ دھیرے دھیرے ملک وقوم کے تئیں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہم میں کم ہوتا جارہا ہے۔ ہم ذاتی، گروہی یا علاقائی اور صوبائی مفادات کو ملکی اور قومی مفادات پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اپنی پرچھائیں سے آگے نہ دیکھنے کی یہ روش جمہوری مزاج کے منافی ہے۔ اگر ہمیں ملک وقوم کی مجموعی ترقی عزیز ہے تو اس روش کو خیرباد کہنا ہوگا۔

علاقائی جھگڑے، زبانوں کے مناقشے، فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی عدم رواداری اور کرپشن یہ ایسی بیماریاں ہیں جو ہندوستانی زندگی میں بے طرح سرایت کرتی جارہی ہیں۔ ان بیماریوں کا علاج ذمے داری کے اسی احساس کی بازیافت ہے جو ہماری غفلتوں میں کہیں گم ہوگیا ہے۔ اس احساس کی بازیافت چنداں مشکل نہیں، ضرورت تھوڑی سی خود احتسابی کی ہے۔ خود احتسابی ہی وہ عمل ہے جو آدمی کو اس کی کوتاہیوں سے آگاہ کرتا اور ان کے ازالے پر آمادہ کرتا ہے۔

تو آیئے ہم صمیم قلب سے عہد کریں کہ ہمارے جمہوری آئین نے ہمیں فکر وعمل کی جو آزادیاں دی ہیں، ان کے استعمال میں ہم حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کریں گے اور ان آزادیوں سے متمتع ہونے کے ساتھ ساتھ ان ذمے داریوں کو بھی تندہی سے نباہیں گے جو ہمارا یہی جمہوری آئین ہم پر عائد کرتا ہے۔ اصلاح احوال کے لیے صرف سیاسی رہنماؤں کی طرف دیکھتے رہنا اپنی ذمے داریوں سے روگردانی کے مترادف ہوگا۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ بہت سی خرابیاں ایسی ہیں جو ہنگامی سیاست ہی کی پیدا کردہ ہیں اور یہ تبھی دور ہوں گی جب آپ اور ہم سیاست سے اوپر اٹھ کر انھیں دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں

یہ ہماری زبان کی بدنصیبی ہی کہی جائے گی کہ اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویزیں بار بار اٹھتی ہیں، گویا رسم الخط نہ ہوا کوئی ایسا داغ بدنامی ہوا کہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانا بہت ضروری ہو۔ کبھی اس کے لیے رومن رسم خط تجویز ہوتا ہے، کبھی دیوناگری اور افسوس کی بات یہ ہے کہ رسم خط میں تبدیلی کی بات کہنے والے اکثر خود اہل اردو ہی ہوتے ہیں۔ جب سے انگریز بہادر کی نگاہ کرم اس بات پر پڑی، اس کے دوست نما دشمنوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی ہے۔ انگریزوں نے پہلے تو اس کا نام "ہندی" سے بدل کر "ہندوستانی" رکھنا چاہا۔ جب وہ نہ چلا تو ان کی خوش قسمتی سے لفظ "اردو" ان کے ہاتھ آ گیا۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر تک "زبان اردوے معلّٰی" کا خطاب فارسی کے لیے عام تھا۔ اور لفظ "اردو" کے معنی تھے "شاہجہاں آباد کا شہر" یا "قلعۂ معلّٰی شاہجہاں آباد" جب دہلی (یعنی اردو بمعنی "دہلی شہر") میں ہندی (یعنی آج کے معنی میں اردو زبان) عام ہوئی تو اس کو (یعنی "ہندی" کو) "زبان اردوے معلّٰی" کہا جانے لگا۔ پھر مختصر ہوتے ہوتے یہ فقرہ "زبان اردو"، یا "اردو کی زبان" اور پھر صرف "اردو" رہ گیا۔ انگریزوں کو بھی یہ بات موافق آتی تھی، کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ ہندوؤں کی کوئی الگ زبان ہو اور وہ "ہندی" کہلائے۔ لہٰذا انھوں نے "ہندی" کا نام ہماری زبان سے چھین کر ایک نئی زبان کو دے دیا، اور ہماری زبان کا نام صرف "اردو" رہ گیا۔ یعنی انگریزوں کی مہربانی سے ہماری زبان سارے ہندوستان کی زبان کے بجائے "اردو" یعنی "لشکر بازار" یا "شاہی کیمپ اور دربار" کی زبان ٹھہری۔

انگریزوں نے دوسرا ستم یہ کیا کہ انھوں نے لفظ "اردو" کے معنی "لشکر بازار، شاہی کیمپ اور دربار" نہیں، بلکہ "فوج، لشکر" بیان کیے۔ آہستہ آہستہ یہ بات اتنی مقبول ہوئی کہ سب اردو والے بھی یہی سمجھنے لگے کہ ہماری زبان دراصل ایک فوجی اور لشکری زبان ہے۔ ابھی حال ہی میں "ہماری زبان" میں ایک نظم چھپی ہے جس میں یہ بات کم و بیش تحریراً کہی گئی ہے کہ اردو "لشکری" زبان ہے۔ احسن مارہروی نے 1910 میں ایک طویل نظم "اردو لشکر" کے نام سے لکھی اور طبع کرائی تھی۔ میں نے اس کا ایک نسخہ نظامی بک ایجنسی بدایوں کے یہاں سے بڑے اشتیاق سے منگوایا کہ دیکھیں۔ آج سے کوئی سو برس پہلے احسن مارہروی نے اردو زبان کے نام کے بارے میں شاید کوئی دلچسپ بات کہی ہو، یا شاید یہ بتانا چاہا ہو کہ اردو دراصل "لشکری" زبان نہیں ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس نظم میں وہی عام بات دہرائی گئی ہے کہ اس زبان کی پیدائش اور ترقی مسلمانوں کے زمانے میں اور ان کی فوج وغیرہ میں ہوئی۔ لفظ "اردو" کے غلط لیکن مقبول معنی "لشکر" کی مناسبت سے احسن مرحوم نے اپنی نظم کا نام "اردو لشکر" رکھ دیا، اور ولی دکنی سے لے کر اپنے زمانے تک کے بڑے ادیبوں کو "اردو لشکر کے سردار" قرار دیا:

ابتدا اس کی ہوئی ہے اس زمانے میں یہاں
جب مسلمانوں کا تھا ہندوستاں میں خوب راج
گو عدالت کی زباں اردو نہ تھی پھر بھی بہت
فوج میں بازار میں چلتا تھا اس سے کام کاج

اس پر طرہ یہ کہ اردو کو انگریزوں کا احسان مند ٹھہرایا گیا ہے۔ احسن ماہروی کہتے ہیں:

ہے گورنمنٹ اپنی عادل ہم کو ہے اس سے امید
وہ ہمارے حال پر فرمائے گی بے شک کرم
کی حمایت جس قدر اردو زباں کی آج تک
وہ نہیں کچھ کم جو آسانی سے ہوجائے رقم
عدل پر اس سلطنت کے ناز کرنا چاہیے
ایسے عادل ایسے منصف تھے نہ کسریٰ اور جم

ایسی صورت میں اگر گلکرسٹ (Dr. John Gilchrist) کو اردو کا محسن اعظم قرار دیا گیا تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ اگر ہماری زبان کا اصل نام، یعنی "ہندی" برقرار رکھا جاتا تو یہ افسانہ گھڑنا اور رائج کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ لشکری زبان ہے۔ بھلا کون تھا جو تسلیم کرتا کہ جس زبان کا نام "ہندی" ہو، اسے لشکریوں اور فوجیوں نے رائج کیا تھا؟ میر امن نے جب "باغ و بہار" میں "اردو" (یعنی دہلی) کی زبان کی "تاریخ" اپنے لفظوں میں بیان کی تو انھوں نے سب سے بڑی ناانصافی اس زبان کے ساتھ یہ کی کہ انھوں نے یہ کہیں کہا ہی نہیں کہ یہ زبان (جسے وہ "اردو" کی زبان کہہ رہے ہیں) دراصل "ہندی" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ تو کہا کہ اس زبان کو "اردو" (یعنی دہلی) کے سارے لوگ بولتے ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان، کیا عورتیں کیا مرد، کیا بچے کیا بوڑھے، لیکن انھوں نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ اس زبان کا نام "ہندی" ہے۔ جب میر کہتے ہیں:

کیا جانے لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

تو ان کی مراد جے شنکر پرشاد اور رام چندر شکل کی ہندی سے نہ تھی، اور نہ ٹی وی اور آکاش وانی کی ہندی سے تھی۔ لفظ "ہندی" سے میر وہی زبان مراد لے رہے تھے جس میں وہ شعر کہتے تھے اور جسے ہم آج "اردو" کہتے ہیں۔

جب ہماری زبان کا نام "ہندی" سے "اردو" بنا دیا گیا تو انگریزوں اور انگریزوں کے حمایتی "قوم پرست" ہندوؤں کی توجہ رسم خط پر زیادہ زور وشور سے ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ اپنی خوبصورتی، کم جگہ میں زیادہ الفاظ کھپا دینے کی صلاحیت، فنکارانہ تنوع کے امکانات، اور فارسی، عربی، سنسکرت سے اس کے ربط کے سبب سے اردو کا رسم الخط ہندوستانی تہذیب کی شانوں میں ایک شان ہے اور اردو کے مخصوص حالات کو مدِ نظر رکھیں تو اسے اردو زبان کی جان کہا جاسکتا ہے۔ یعنی موجودہ حالات میں اردو کا رسم الخط بدلنے کی تجویز درحقیقت اردو کو موت کے گھاٹ اتارنے کی تجویز ہے۔ رنج کی بات یہ ہے کہ اردو کے مخالفین، اور دوست نما دشمن، مدت دراز سے اس کے رسم الخط کو اپنی دشمنی کا ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

اردو کا رسم الخط بدل کر اسے رومن میں لکھنے کی تجویز سب سے پہلے حضرت گلکرسٹ (Gilchrist) نے رکھی تھی۔ افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر اب بھی گلکرسٹ کو اردو زبان کے محسنین میں شمار کرتے ہیں، جبکہ حقیقت برعکس ہے۔ اپنی کتاب The Oriental Fabulist مطبوعہ 1803 میں گلکرسٹ نے بخیال خود یہ ثابت کیا تھا کہ اردو ہی نہیں، بلکہ اور بھی کئی ہندوستانی زبانوں کو رومن رسم خط میں "آسانی اور صحت کے ساتھ" لکھا جاسکتا ہے۔ اس معاملے پر تھوڑی سی بحث مرحوم عتیق صدیقی نے اپنی کتاب Origins of Modern Hindustani Literature مطبوعہ علی گڑھ 1963 میں پیش کی ہے۔ لیکن گلکرسٹ کی تجویز میں جو سامراجی تکبر اور حاکمانہ تنگ نظری پنہاں ہے، اس کی طرف عتیق صدیقی نے اعتنا نہیں کیا۔ اس تجویز پر اعتراض کے بجائے صدیقی مرحوم نے اسے "ہندوستان کو متحد کرنے کی قابل تعریف کوشش" کا نام دیا ہے۔

گلکرسٹ کی بات پر اس وقت شاید زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ لیکن جب انگریزوں کے زیر اثر اردو اور "ہندی" کی تفریق قائم ہونے لگی، اور "ہندی" زبان کو ہندوؤں کے "قومی تشخص" کی پہچان بنایا جانے لگا، تو ملک کے ایک طبقے نے، جو انجانے میں انگریزی سامراج کا شکار بن چکا تھا، اردو کی مخالفت کو بھی "ہندی" کے قیام کے لیے ضروری جانا۔ اردو کی مخالفت جن بنیادوں پر کی جانے لگی، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اردو کا رسم خط "ناقص ہے" یا / اردو غیر ملکی ہے۔ چنانچہ راجندر لال مترا نے 1864 میں ایک مضمون بزبان انگریزی لکھا اور اپنے تئیں ثابت کیا کہ ناگری رسم الخط کو اردو رسم الخط پر فوقیت ہے۔ اس زمانے میں اردو رسم خط کو رومن کر دینے کی بات اتنے زور شور سے اٹھائی جارہی تھی کہ گارساں دتاسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں سیاسی مصلحت اور دباؤ کے تحت انگریز لوگ اردو کا رسم خط رومن کر ہی نہ ڈالیں۔ دتاسی نے لکھا کہ ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ اس معاملے کی تفصیل کے لیے فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو املا اور رسم الخط" مطبوعہ اسلام آباد ملاحظہ ہو۔

راجندر لال مترا نے اپنے زمانے کے "ہندو قوم پرست" حلقوں پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بھارتیندو ہریش چندر سے بھی ان کے مراسم تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ اگر بھارتیندو کو اردو سے ناگری رسم خط والی "ہندی" کی طرف راغب کرنے میں "ہندو قوم پرست" حلقوں کا ہاتھ تھا، تو انھیں اردو سے متنفر کرنے، اور اس کے رسم الخط میں کیڑے نکالنے کی طرف راجندر لال مترا نے مہمیز کیا ہو۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ وہی بھارتیندو ہریش چندر جنھوں نے 1871 میں لکھا تھا کہ میری اور میرے گھرانے کی عورتوں کی زبان اردو ہے، دس سال بعد ایجوکیشن کمیشن کے سامنے یہ کہتے ہوئے پائے جائیں کہ اردو رسم الخط ایک طرح سے مسلمانوں کی سازش ہے، کہ اس میں "لکھیے کچھ اور پڑھیے کچھ" کی آسانی ہے۔ اس طرح عام سادہ لوح رعایا کو دھوکا دینے کے لیے یہ رسم خط نہایت موزوں ہے! ان معاملات کی تفصیل کے لیے وسودھا ڈالمیا کی کتاب ملاحظہ ہو جو 1997 میں دہلی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے۔ The Nationalization of Hindu Tradition: Bharatendu Harishchandra and Nineteenth Century Banaras اس کے علاوہ ساگری سین گپتا کی پی ایچ ڈی تھیسس بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے اجزا Annual of Urdu Studies No. 91 میں شائع ہوئے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اردو پر "لکھیں کچھ، پڑھیں کچھ" کا الزام دھرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ خود دیوناگری اس عیب سے خالی نہیں۔ (اگر یہ عیب ہے) انگریزی وغیرہ کا تو پوچھنا کیا ہے، کہ جہاں معمولی آوازوں، مثلاً ج، ش، ف، وغیرہ کو بیان کرنے کے آٹھ آٹھ نو نو طریقے ہوسکتے ہیں۔ دیوناگری کا حال یہ ہے کہ یہاں کھ (kha) اور رَوَ (ra va) میں کوئی فرق نہیں۔ "رواتا" لکھیے اور "کھاتا" پڑھیے۔ دھ (dha) اور گھ (gha) میں اتنا کم فرق ہے کہ ذرا سی لرزش قلم سے گھر کی جگہ "دھر"، "دھان" کی جگہ "گھان" ہوجاتا ہے۔ تھ (tha) اور ی (ya) میں بھی اسی قدر کم فرق ہے کہ "تھان" کو "یان" پڑھ لینے کا پورا پورا امکان ہے۔ نون غنہ لکھنے کے لیے طرح طرح کے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ اس ایک ہی آواز کو تین چار طرح لکھا جاتا ہے۔ "چندر بندو" کچھ

ہے، ''ژاں'' اور طرح سے ہے، صرف ''بندی'' اور طرح کی ہے، اور کہیں آدھا ma (مَ) لگا دیتے ہیں۔ اس رنگ کے الجھاوے اور بھی ہیں، لیکن مثال کے لیے اتنے کافی ہوں گے۔ پھر اس دعوے کے کیا معنی کہ دیوناگری میں غلط پڑھنے کی گنجائش نہیں؟

کھڑی بولی کے متعدد الفاظ دیوناگری میں لکھے ہی نہیں جاسکتے، مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ کی لکھائی سے دیوناگری قاصر ہے:

کوا، لئے، گاؤں، ڈیوڑھا، بہن، کواڑ، کوئی، بروزن فَعَل [وتد مجموع] یا بروزن فع [سبب ثقیل] وغیرہ۔

اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگنت الفاظ ایسے ہیں جن میں وسطی یا آخری حرف ساکن ہے لیکن دیوناگری انھیں متحرک لکھنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ، چلنا chalana فاصلہ fasala چکنا Chikana، گھاس ghasa، جنتا janata وغیرہ لکھنا اور چلنا، راستہ، چکنا، گھاس، جنتا وغیرہ میں متحرک لکھے ہوئے حرف (ل، س/ص، ک، س، ن) کو ساکن پڑھنا پڑتا ہے جو ناگری رسم تحریر کی روح کے خلاف ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کھڑی بولی (یعنی اردو) اور ناگری رسم خط میں کوئی مناسبت نہیں۔ کھڑی بولی جو بعد میں اردو ہندی یعنی اردو کہلائی، وہ ناگری میں لکھی جانے کا تقاضا ہی نہیں کرتی۔ دیوناگری رسم الخط اور کھڑی بولی میں باہم مناسبت ہوتی تو یہ مشکلات بھی نہ ہوتیں اور یہ عدم مناسبت نہ ہوتی۔

عام اردو والوں نے رسم خط کی تبدیلی، یا املا میں ''اصلاح'' کی تجاویز کو کبھی لائق توجہ نہ جانا۔ یہ ان کی سلامتی طبع کی دلیل ہے۔ لیکن اردو کے بعض ''خیر خواہ'' حضرات کو خواہ مخواہ ہی کرید لگی رہتی ہے کہ اس بے چاری غریب کی جورو کو اپنی بھاوج بنا کر چھیڑتے رہیں۔ آزادی کے فوراً بعد ترقی پسند حلقوں سے آواز اٹھائی گئی کہ اس زبان کو زندہ رہنا ہے تو اسے اپنا رسم الخط بدل کر دیوناگری کر لینا چاہیے۔ جب اس بات پر کسی نے کان نہ دھرے تو آزادی کے دو دہائی بعد پھر بعض لوگوں نے، جن میں کچھ بہت بڑے ترقی پسند نام بھی انفرادی طور پر شامل تھے، یہی نعرہ بلند کیا۔ اس بار احتشام صاحب جیسے جید مفکر اور صائب الرائے ترقی پسند ادیب نے بھی اس آواز کو سختی سے دبا دینے کا مشورہ دیا۔ لیکن اردو کی بے چارگی اس کے ''دوستوں'' کو ایسی دلکش لگتی ہے کہ وہ اسے بار بار رسوا کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی سیاسی لوگوں کو شوق چراتا ہے کہ اردو کی ''اصلاح'' فرمانے والوں میں اپنا بھی نام لکھوا لیں۔ چنانچہ آج ایک طرف تو ہمارے کچھ بہت بڑے ادیب کسی نہ کسی عنوان سے اردو کے رسم الخط میں تبدیلی لانے کی بات کرتے ہیں، تو دوسری طرف مولانا ملائم سنگھ بھی اردو والوں سے کہتے ہیں کہ رسم الخط بدل ڈالو، فائدے میں رہو گے۔ (یہی بات مرارجی دیسائی بھی کہتے تھے) فائدہ کیا ہوگا، اس کا حساب تو آسان ہے، کہ بہت ہی کم فائدہ ہوگا۔ لیکن نقصان کتنا ہوگا، اس کا حساب ناممکن ہے، کیوں کہ رسم الخط کی تبدیلی کسی بھی زبان کے لیے خسران عظیم کا باعث ہوتی ہے۔ اردو جیسی بتیس دانتوں میں دبی ہوئی ایک زبان بیچاری کا تو پوچھنا ہی کچھ نہیں کہ رسم خط کھو کر وہ کس قعر مذلت میں جا گرے گی۔

اہل اردو براہ کرم اپنے تاریخی سرمائے پر نظر ڈالیں، انگریزوں کی سیاست کو خیال میں لائیں۔ اردو کے رسم خط میں تبدیلی کی ہر سفارش کے ڈانڈے انگریزوں کی ان سازشوں سے ملتے ہیں جو انھوں نے اردو/ہندی کا جھگڑا پیدا کر کے اس ملک کے ہندو مسلمان میں تفرقہ ڈالنے کی غرض سے رچی تھیں۔

گلکرسٹ نے اپنی کتاب The Oriental Linguist مطبوعہ 1802 (اول ایڈیشن 1798) میں لکھا ہے کہ میں جس زبان (یعنی اردو) کو ''ہندوستانی'' کا نام دینا چاہتا ہوں، اس کا اصل نام تو ''ہندی'' یا ''ہندوی'' ہے، لیکن اس سے ہمارا خیال ہندوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ''ہندی/ہندوی'' وہ زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ''حملوں'' کے پہلے بولی جاتی تھی۔ [بہت خوب، اسی تحقیق کے بل بوتے پر ہم اہل اردو مسٹر گلکرسٹ کو السنۂ ہند کا ماہر گردانتے ہیں! بہرحال آگے سنیے]۔ گلکرسٹ نے مزید فرمایا کہ یہ بات تو ہے کہ اس [یعنی جس زبان کا نام میں ''ہندوستانی'' رکھنا چاہتا ہوں] زبان کے بولنے والے اسے ''ہندی/ہندوی'' ہی کہتے ہیں، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہندوستانی بیوقوف لوگ ہیں، انھیں ان باریکیوں کی طرف متوجہ بھی کیا جائے تو وہ خاک نہ سمجھیں گے۔ یہ نام (''ہندی'') تو ہندوؤں کی زبان کا ہونا چاہیے۔ رفتہ رفتہ ''ہندی'' کا وہ روپ بھی نمودار ہوگا جس میں سنسکرت اور دیگر ''ہندوستانی'' عناصر کی کثرت ہوگی۔ مسلمان ''ہندوستانی'' کو، اور ہندو لوگ ''ہندی'' کو اختیار کر لیں گے۔ یہ دو طرز اس ملک میں مقبول ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا بیانات کی لغویت کی طرف آپ کو متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان باتوں کی تردید کرنے کے بجائے خود ہم نے بھی اپنی ہی زبان کی برائیاں شروع کر دیں۔ لیکن ایک بات یہاں ضرور ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ گلکرسٹ کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اردو والوں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ فارسی عربی سے بھری ہوئی زبان لکھیں۔ بلکہ ''ہندی'' والوں کو سمجھایا گیا کہ تم سنسکرت بھری زبان لکھو۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاراچند کی کتاب The Problem of Hindustani (مطبوعہ الہ آباد 1944)

کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ انگریزوں کی خوشامد کے باوجود احسن مارہروی کو قومی یکجہتی کا اس قدر پاس ہے کہ انھوں نے اپنی طویل نظم "اردو لشکر" (جس کا ذکر اوپر ہوا) میں فارسی عربی لفظوں کو مع عطف و اضافت لکھنے سے گریز کیا ہے۔ اور انشا تو بہت پہلے "رانی کیتکی کی کہانی" لکھ کر ثابت کر چکے تھے کہ فارسی عربی الفاظ کے برتے بغیر بھی اردو لکھی جا سکتی ہے۔ (اور لطف یہ ہے کہ آج ہندی والے اس کتاب کو اپنی نثر کے شاہکاروں میں گنتے ہیں!) انگریزوں کی سیاست کس کس طرح اردو زبان اور اس کے بولنے والوں پر کارگر ہوئی، اس کو سمجھنے کے لیے آلوک رائے کی کتاب Hindi Nationalism مطبوعہ Longmans سنہ 2001 ملاحظہ ہو۔ آلوک رائے صاحب فرزند ہیں امرت رائے کے، لیکن انھوں نے اس کتاب میں امرت رائے کی بدنام زمانہ کتاب A House Divided کے بیانات کی قلعی کھول دی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے ولایت میں رہنے والے بعض اہل اردو کی طرف سے آواز اٹھی ہے کہ اردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے۔ وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انگلستان میں رہنے والے اہل اردو کے بچے اردو بول تو سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے۔ لہٰذا اگر اردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے تو وہ بخوبی اردو پڑھ اور لکھ بھی سکیں گے۔ ممکن ہے یہ تجویز کسی ایک فرد واحد کو، یا کسی گروہ کو اچھی معلوم ہوتی ہو، لیکن اس کے پس پشت دراصل سہل انگاری اور کاہلی ہے، کہ ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی زحمت کاہے مول لیں، کیوں نہ اردو کو انگریزی کر دیں، ہرے لگے گی نہ پھٹکری اور رنگ (ان کے خیال میں) چوکھا آئے گا۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ اگر یورپ اور امریکہ کے سیکڑوں مقامات میں پھیلے ہوئے لیکن مٹھی بھر یہودی اپنی زبان Yiddish کو اتنا فروغ دے سکتے ہیں کہ اس میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوں، اور ہر یہودی، وہ چاہے جہاں بھی رہتا ہو، یدش پڑھ اور لکھ لیتا ہو، تو اردو والے جو صرف انگلستان میں لاکھوں کی تعداد میں ہیں، ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

جب بنارس اور الٰہ آباد کے بنگالی یہاں چار سو برس سے رہتے رہنے کے باوجود اردو کے مذکر مونث، واحد جمع میں اب بھی غلطی کرتے ہیں، کیوں کہ بنگالی میں مذکر مونث نہیں ہے، اور اردو کے واحد جمع کے قاعدے بنگالی میں نہیں چلتے، تو اردو کے لوگ چند ہی برسوں میں اپنی زبان سے اتنے دور کیوں ہو جاتے ہیں کہ انھیں اسے لکھنا پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے؟ پھر الٰہ آباد میں تو متعدد ایسے بنگالیوں سے بھی میری ملاقات ہے جو اردو اور بنگالی میں مکمل طور پر ذولسان ہیں۔ ممکن ہے وہ اردو پڑھ نہ سکتے ہوں، لیکن ان کا شین قاف اتنا ہی درست ہے جتنا کسی اردو والے کا ہو سکتا ہے۔ اور آپس میں وہ اس دھڑلے سے بنگالی میں بات چیت کرتے ہیں کہ ہم لوگ منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جو قومیں اپنی زبان اور تہذیب پر افتخار رکھتی ہیں ان کے یہی طور ہوتے ہیں۔ نہ معلوم ہم لوگ اپنی زبان کے بارے میں اس قدر مدافعانہ اور اعتذاری رویہ کیوں اپنائے بیٹھے ہیں؟

خیر، اب ان باتوں سے قطع نظر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اردو کا رسم الخط رومن کر دینے میں کئی طرح کے نقصانات عظیم ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(1) اردو کا رسم الخط بدلنا اردو زبان اور ادب دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ بدلا ہوا رسم خط خواہ رومن ہو یا ناگری، اس سے اردو زبان اور ادب دونوں کو ایسا دھکا پہنچے گا کہ ممکن ہے کہ وہ جاں بر ہی نہ ہو سکے۔ وہ گراں قدر ادبی سرمایہ جو گذشتہ پانچ چھ سو برس سے اردو کے اپنے رسم خط میں لکھا گیا ہے، تقریباً سارے کا سارا ضائع ہو جائے گا۔ ہم اپنے کلاسیکی متون، اور کلاسیکی ہی کیوں، گذشتہ پانچ دہائی کے بڑے متون کے بھی اچھے ایڈیشنوں کے معاملے میں بہت مفلس ہیں۔ جو تہذیب اور معاشرہ اپنے بڑے ادیبوں کے اہم ترین متون کو بھی بازار میں دستیاب نہیں رکھتا، اس سے توقع کرنا فضول اور خام خیالی ہے کہ وہ اپنے سارے گذشتہ سرمائے کو نئے رسم الخط میں منتقل کر کے اسے عام اور متداول کرے گا۔ رسم الخط بدلا گیا تو دس برس بھی نہ گذریں گے کہ زبان اور ادب دونوں پر خاک اڑنے لگے گی اور اردو کے دشمن دل و جان سے یہی چاہتے ہیں۔ اس وقت تو یہ عالم ہے کہ نہ میر کا کوئی معتبر کلیات بازار میں ملتا ہے، نہ میر انیس کا، نہ نصرتی یا باقر آگاہ کا۔ پریم چند، نذیر احمد، منٹو، راشد الخیری، حسن نظامی، بیدی، امجد حیدرآبادی وغیرہ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ لیکن ان کے پرانے ایڈیشن موجود ہیں اور پڑھنے والے انھیں پڑھ بھی سکتے ہیں۔ جب اردو کا رسم خط رومن یا ناگری ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ ان کے پڑھنے والے عنقا ہو جائیں گے۔ کچھ دن بعد اردو کا پرانا سرمایہ اردو میں پڑھنے والا کوئی نہ ہوگا، حتیٰ کہ یہ پرانے، گلے سڑے ایڈیشن بھی کچھ لائبریریوں اور کچھ کباڑیوں کے علاوہ کہیں اور نہ ملیں گے اور رومن یا ناگری میں یہ متون دستیاب ہوں گے نہیں۔ پھر نتیجہ ظاہر ہے۔

(2) فرض کیا کوئی صورت ایسی نکل آتی ہے کہ اردو کا سارا ادب نہ سہی، سارا اعلیٰ ادب پہلے رومن یا ناگری میں منتقل کر لیا جائے، پھر رسم الخط بدلا جائے۔ اول تو یہ ممکن نہیں اس کام کے لیے روپیہ ہی اتنا درکار ہوگا کہ ایک پوری حکومت کا خرچ اس سے چل جائے گا۔ لیکن مان لیا یہ ممکن ہوا بھی تو ہم جس رسم خط کو اختیار کریں گے، اس کے اپنے مسائل ہمارے

سامنے آئیں گے، اوران کا اب تک کوئی حل نہیں بہم ہوسکا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہوگی کہ جب اردو رسم خط ہی میں ایسے ایڈیشن نہیں ملتے جن کو پوری طرح صحیح نہیں تو کم وبیش لائق اعتماد کہا جاسکے، تو اردو سے ناگری یا رومن میں منتقل کرنے کے لیے کس ایڈیشن کو معتبر مانا جائے گا؟ اور بہت سی اہم کتابیں یا اہم شعرا کے کلیات تو ابھی طباعت پذیر بھی نہیں ہوئے۔ ان کے کس نسخے کو بنیادی متن قرار دیا جائے، اور کیوں؟

(3) رسم الخط بدلنے سے پہلے سب سے بڑا سوال یہ طے ہونا چاہیے کہ نئے رسم الخط میں اردو الفاظ کا محض تلفظ ظاہر کیا جائے گا، یا املا بھی ظاہر کیا جائے گا؟ اگر صرف تلفظ ظاہر کیا جائے گا تو نئے رسم الخط میں اردو کے بہت سے حروف تہجی باقی نہ رہیں گے۔ مثلاً س، ص، ث، سب کو ایک ہی علامت کے ذریعے ظاہر کیا جائے گا۔ اسی طرح ع اور الف میں ایک قائم رکھا جائے گا، ایک ترک ہوگا۔

(4) جن لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اردو کا رسم الخط رومن کردیا جائے ان سے درخواست ہے کہ اس تجویز میں مضمر خرابیوں، اور اس پر عمل درآمد ہونے کے خاص نقصانات کو دھیان میں لائیں۔ ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

(5) اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے لیے کوئی ایسا نظام ابھی تک نہیں ہے جسے سب قبول کرتے ہوں۔ بہت سے لوگ من مانی کرتے ہیں، بہت سے لوگ Library of Congress کے نظام پر عمل کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ Library of Congress کے نظام میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کرکے اسے برتتے ہیں۔ بہت سے لوگ کم وبیش وہ نظام استعمال کرتے ہیں جو عربی سے رومن کرنے کے لیے متداول ہے۔ بہت سے لوگ کوئی اور نظام بکار لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، خ لکھنے کے لیے حسب ذیل مختلف طریقے مستعمل ہیں:

چھوٹا ایکس (small x)

چھوٹا کے اور چھوٹا ایچ (kh)

چھوٹا کے اور چھوٹا ایچ، لیکن دونوں حرفوں کے نیچے لکیر (kh)

بڑا کے (K)

لہٰذا سوال یہ ہے کہ جب مختلف لوگ ایک ہی حرف کو رومن رسم خط میں مختلف طرح ادا کریں گے، کوئی کچھ لکھے گا، کوئی کچھ، تو بچے کی تعلیم کس طرح ہوگی؟

یا پھر یہ ہوگا کہ کم وبیش ہر گھر میں رومن اردو اپنی ہی طرز کی ہوگی۔ کسی کا کسی سے میل نہ ہوگا۔ اور اس کا امکان زیادہ ہے کہ ہر بااثر طبقہ اپنے طور پر اپنے قاعدے اختیار کرے گا۔ جس زبان کے بولنے والے ابھی تک اس بات پر متفق نہ ہوسکے کہ "دعویٰ" لکھیں یا "دعوا"، "گذر" لکھیں یا "گزر"، "توتا" لکھیں یا "طوطا"، "وطیرہ" لکھیں یا "وتیرہ"، "رحمٰن" لکھیں یا "رحمان"، "تمغا" لکھیں یا "تمغہ"، "معمہ" لکھیں یا "معما"، "مہینہ" لکھیں یا "مہینا"، "پیسہ" لکھیں یا "پیسا"، "تماشہ" لکھیں یا "تماشا"، "گئے" لکھیں یا "گیے"، وغیرہ صدہا مثالیں ہیں)، اس کے بارے میں یہ توقع کرنا خام خیالی ہے کہ سب لوگ کان دبا کر ایک ہی قاعدے پر اتفاق کرلیں گے اور جھگڑا نہ کریں گے۔ یہاں تو ابھی یہ عالم ہے کہ یہی فیصلہ کرنے میں سر پھٹول ہورہی ہے کہ "کھ"، "بھ" وغیرہ مخلوط آوازوں کو اردو حروف تہجی مانا جائے کہ نہیں؟ اور اگر مانا جائے تو انھیں کہاں جگہ دی جائے؟ "ب" کے فوراً بعد "بھ" آئے یا بڑی "ے" کے بعد؟ لغت لکھتے وقت پہلے "بیٹا" کا اندراج ہو یا "بھاری" کا؟ ابھی تو اسی پر تکرار ہے کہ لغت لکھتے وقت الف مد (آ) والے لفظ پہلے آئیں گے کہ خالی الف والے؟ بظاہر تو یہ بات ایسی ہے کہ اس میں کسی بحث یا اختلاف کی ضرورت ہی نہیں، لیکن اگر آپ اردو کے "مستند" لغات ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس باب میں "نوراللغات" کا عمل کچھ ہے، "آصفیہ" کا کچھ اور ہے، فیلن کا کچھ دوسرا ہی ہے، اور ترقی اردو بورڈ، پاکستان، کے عظیم الشان "اردو لغت، تاریخی اصول پر" کے خیالات دیگر ہیں۔ ایسی صورت میں یہ امید کرنا کہ سب لوگ تبدیل خط (Tranliteration) کے ایک ہی اصول پر اتفاق کرلیں گے، یا جلد اتفاق کرلیں گے، محض امید پرستی ہے۔

(6) اردو میں بہت سی آوازیں ایسی ہیں جنھیں رومن رسم الخط ادا نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر، حسب ذیل الفاظ کو رومن میں صحیح لکھنا غیر ممکن ہے۔

بہن، قاعدہ، کہنا، کوا، کواں، دودھاری (بمعنی دو دھاروں والی، مثلاً دو دھاری تلوار)، دعا وغیرہ۔

ان الفاظ میں زیر زبر پیش کی جو آوازیں ہیں وہ رومن یا ناگری میں نہیں ادا ہوسکتیں۔

(7) اگر صرف لفظ کو ادا کرنا ہے (اور بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے) تو اردو کے ہزاروں الفاظ کا تلفظ بگاڑ کر رومن میں لکھنا ہوگا۔ مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ کو دیکھیں:

پردہ، اگر اسے parda لکھیں تو لفظ غلط ہوجاتا ہے۔ اگر pardah لکھیں تو اور بھی غلط ہوجاتا ہے۔ اگر اسے pard لکھیں تو کوئی لفظ ہی نہیں بنتا۔ (ملحوظ رہے کہ بعض اوقات اسے انگریزی لفظ قرار دیتے ہیں

تو اسے purdah لکھتے ہیں)۔

گناہ، اسے اگر gunah لکھیں تو h کی آواز انگریزی میں غائب ہو جائے گی، صرف ''گنا'' سنائی دے گا۔ انگریزی میں کوئی طریقہ ایسا نہیں کہ آخر میں آنے والی ہائے ہوز کی آواز کو محفوظ رکھ سکیں۔ مجبوراً اسے gunaha لکھنا پڑے گا جو تلفظ کے قطعاً منافی ہے۔

کارواں، اگر اس کے نون غنہ کے لیے کوئی ایک علامت سب لوگ مقرر کر بھی لیں تو رومن میں اس لفظ کو یا تو karvan لکھیں گے، یا karavan لکھیں گے۔ اردو کے لحاظ سے دونوں تلفظ غلط ہیں۔ اردو میں ''کارواں'' کی رائے مہملہ ساکن ہے، لیکن اس پر ہلکا سا زبر بھی ہے۔ رومن میں وسطی سکون ظاہر کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے اور جس طرح سکون/حرکت ''کارواں''، ''فیصلہ'' جیسے بے شمار لفظوں میں ہے اس کے لیے رومن میں کچھ بھی انتظام نہیں۔

میر (یائے معروف)، دور (واؤ معروف) جیسے کتنے ہی الفاظ ہیں جو بہ اعتبار تلفظ رومن میں ادا نہیں ہو سکتے۔ انگریزی میں mir کا تلفظ me'ar اور duur کا تلفظ du'ar ہے، کیوں کہ انگریزی تلفظ کے اعتبار سے آخری R نہیں بولا جاتا۔ اگر اسے بولنا ہے تو اس کے پہلے یا بعد حرکت دینی ہوگی، جو اردو تلفظ کے منافی ہے۔ اردو جاننے والے تمام انگریز اور امریکن اپنی زبان کی مجبوری کے باعث ''میر'' کو mere بروزن fear بولتے ہیں۔ ایک مدت ہوئی جب میں (زیادہ تر طالب علمی کے دنوں میں) انگریزی میں فلمیں دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب فلم کا نام یاد نہیں رہا، لیکن اس میں ایک ہندوستانی کردار ''کبیر'' نامی تھا۔ مجھے اس کا تلفظ kabi'ar سن کر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ بعد میں مغربی ممالک میں ہر جگہ میں نے یہی صورت پائی۔ ''کشمیر'' کے پرانے ہجے اسی وجہ سے Cashmere تھے اور ایک خاص طرح کا اونی کپڑا آج بھی Cashmere کہلاتا ہے۔ اسی طرح ایک خاص طرح کے ریشمی کپڑے کو Madras کہتے ہیں، اور چونکہ اس ہجے میں دونوں A کی قیمت غیر معلوم ہے، لہٰذا اس لفظ کو انگریزی قاعدے کے مطابق آج بھی ''میڈرس'' (''میڈ'' بروزن sad اور ''رس'' بروزن fuss) کہتے ہیں۔

(8) عربی فارسی، خاص کر عربی کے اگنت الفاظ ہیں اردو میں جن کے تلفظ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کے بارے میں اختلاف نہیں، لیکن اردو میں ان کا تلفظ عربی/فارسی سے مختلف ہے۔ خیر، جہاں اختلاف نہیں، وہاں تو ممکن ہے کہ رومن میں بھی اردو کے تلفظ کو اپنا لیا جائے (حالانکہ بہت سے لوگ نہ مانیں گے) لیکن جہاں اختلاف ہے وہاں کیا کیا جائے، مثلاً:

rivayat لکھیں کہ ravayat؟ murawat لکھیں کہ muruu'at؟ hisab لکھیں کہ hesab یا hasab؟ mihdi لکھیں کہ mahdi یا mehdi؟ (یہ خیال رہے کہ انگریزی میں Mihdi/Mahdi/Mehdi جو بھی لکھیں، حرف h پڑھنے میں نہ آئے گا اور بچے کو یہ سیکھنے میں بہت مشکل ہوگی کہ یہاں حرف h صاف صاف بولا جائے گا۔) taqii'ah لکھیں یا taqaiyah یا taqayyiah؟ sayyid لکھیں یا sayyad یا saiyad یا syed؟ janaza لکھیں یا janazah؟ zimam لکھا جائے کہ zamam؟ qabool لکھنا بہتر ہے کہ qubool؟ اسی طرح sha'oor, درست مانا جائے یا shu'oor؟ furogh اچھا ہے کہ farogh؟

(9) ایک مشکل ان لفظوں میں ہوگی، اور ایسے لفظ بہت ہیں، اور رائج بھی ہیں، جن کو شعر میں تو اصل تلفظ کے اعتبار سے نظم کیا جاتا ہے، لیکن بول چال میں ان کا تلفظ کچھ اور ہے۔ مثلاً:

شمع، شکل، ذبح، شہد، ہرج، طرح، اطمینان، حرکت، کلمہ، صدقہ، وغیرہ۔

(10) بہت سے ایسے لفظ ہیں جو موقعے یا رواج کے اعتبار سے کئی طرح بولے جاتے ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟ مثلاً یہ الفاظ رومن میں کس طرح لکھے جائیں گے؟

کہ: اس کے تین تلفظ ہیں۔ (1) کاف کے بعد ہلکی یائے معروف، (2) کاف کے بعد ہلکی یائے مجہول، (3) کاف کے بعد لمبی یائے مجہول۔ اور اگر ضرورت ہو تو کبھی کبھی کاف کے بعد طویل یائے معروف بھی بولی جاتی ہے۔

لیلیٰ، اور اس قسم کے تمام الفاظ جن کا تلفظ کبھی کبھی یائے معروف سے کرتے ہیں (بروزن ''پہیلی'') اور کبھی خاص کر اضافت کی حالت میں الف مقصورہ کے ساتھ (بروزن ''پھیلا'')۔

چیونٹی: اس کے تین تلفظ ہیں۔ (1) چیں اونٹی بروزن فاعلن، (2) چوں ٹی بروزن فع لن، (3) چیوں ٹی، یائے مخلوط کے ساتھ، بروزن فع لن۔

حد، خط، کف، رج اور اس طرح کے دوسرے عربی لفظ کے آخری حرف پر تشدید ہے، لیکن وہ صرف اضافت کی حالت میں کبھی کبھی بولی جاتی ہے۔

مچھر، چپراس وغیرہ بہت سے لفظ ہیں جنھیں دلی والے اور بہت سے مشرقی ہندوستان والے، رائے ہندی سے بولتے ہیں (مچھڑ، چپڑاس)، اور باقی لوگ سادہ رائے مہملہ سے۔

(11) اب بعض باتیں اور دیکھ لیجیے۔

اگر املا نہیں ظاہر کرنا ہے تو بہت جگہ تلفظ بھی غلط ہو جائے گا۔ مثلاً مندرجہ ذیل پر غور کریں:

ضعف، سعید، معذور، معقول

ضد کی اور بات ہے، لیکن ان لفظوں میں عین کا تلفظ سراسر الف یا ہمزہ کا نہیں۔ حسب ذیل سے مقابلہ کریں:

زور، لئیق، ماجور، ماقول

صاف ظاہر ہے کہ ضعف/ زور، سعید/ لئیق، معذور/ ماجور اور معقول/ ماقول کے تلفظ ایک نہیں ہیں۔ اول الذکر لفظوں میں تھوڑی سی آواز عین کی سنائی دیتی ہے۔ رومن اسے کس طرح ادا کریں گے؟

جن لفظوں میں واؤ معدولہ مع الف ہے (خوان، خواب) ان کا تلفظ ان لفظوں سے مختلف ہے۔ جن میں واؤ معدولہ بے الف ہے (خوش، خود)۔ ایسے الفاظ میں املا ظاہر کریں تو تلفظ ہاتھ سے جاتا ہے، اور تلفظ ظاہر کریں تو املا کا خون ہوتا ہے۔

رومن میں ہمزہ کا متبادل کچھ نہیں۔ رومن رسم خط میں ہمزہ اور ع اور الف سب ایک ہو جائیں گے۔ مثلاً:

عکس/aks، تاسف/tassuf، عالم/alam

رومن میں پڑھنے والا ان الفاظ میں فتحہ کی آوازوں کا کچھ امتیاز نہ کر سکے گا۔ آہستہ آہستہ ان کا تلفظ بدل جائے گا، اور پھر شاعری کو موزوں پڑھنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔

استدلال ابھی اور بھی ہیں۔ لیکن جو ماننا چاہے اس کے لیے اتنے بہت ہیں، اور جو نہ ماننا چاہے اس کے لیے پوری کتاب بھی کافی نہ ہوگی۔ بہر حال، رسم الخط کی تبدیلی کے مویدین سے میری درخواست ہے کہ وہ مسعود حسن رضوی ادیب کی چھوٹی سی کتاب ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط'' پڑھ لیں۔ اور اگر توفیق ہو تو اسی موضوع پر محمد حسن عسکری اور احتشام حسین کے مضامین بھی دیکھ جائیں۔ شان الحق حقی نے حال میں اچھی بات کہی ہے:

''رسم الخط اپنی زبان کے لیے اور زبان اپنے بولنے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ چند غیر ملکیوں کی سہولت کے لیے اپنی زبان کی کایا پلٹ کرنا مضحکہ خیز حرکت ہوگی... دنیا کو اردو کی طرف متوجہ کرنا ہو تو ہمیں اس کے اندر بہتر سے بہتر ادب پیدا کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس کی دم میں گھنگھنا باندھنے کی۔''

اس پر میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ اردو کا رسم خط اگر رومن کر دیا جائے تو جتنی سہولتیں حاصل ہوں گی ان سے کہیں بڑھ کر مشکلیں پیدا ہوں گی اور یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اگر ایک بار رسم خط کی تبدیلی پر ہم راضی ہو گئے تو یہ تقاضا بار بار اٹھے گا۔ آج لوگ دیوناگری یا رومن کے لیے کہہ رہے ہیں، کل کو کسی اور رسم الخط کے لیے مانگ ہوگی کہ اردو لکھنے کے لیے اسے بھی استعمال کیا جائے۔ خود ہندوستان میں لوگ کہیں گے کہ دیوناگری قبول ہے تو بنگالی کیوں نہیں؟ بنگالی قبول ہے تو تمل کیوں نہیں؟ پھر یہ سلسلہ ختم نہیں ہونے والا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، اپنے رسم الخط یا املا میں تبدیلی کا تقاضا کرنے کی بیماری صرف اردو والوں میں ہے۔ اگر کسی اور زبان والے سے کہیے کہ ''میاں تمھارا رسم خط یا املا ناقص ہے، اسے بدل ڈالو تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائے گا اور ایسا نہیں ہے کہ مغرب میں تیسری دنیا سے آئے ہوئے صرف اردو کے ہی لوگ بستے ہوں۔ ہندوستان اور افریقہ اور ایشیا کی اکثر زبانیں بولنے والوں کی کثیر تعداد مغرب میں مقیم ہے۔ ان میں سے تو کسی کی بھی زبان سے نہیں سنا گیا کہ ہمارے بچوں کو اصل رسم خط میں دقتیں پیش ہوتی ہیں، کیوں نہ اپنی زبان مثلاً مراٹھی، بنگالی، ملیالم، تمل، سواحیلی، ہوکسا، کا رسم خط بدل کر رومن کر دیا جائے۔

کچھ دن ہوئے ایک صاحب کی تجویز نظر سے گزری کہ اردو میں حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ اس سے کمپیوٹر کو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اردو کے حرف بھی الگ الگ لکھے جائیں تو کمپیوٹر کے میدان میں آسانی ہو جائے گی۔

اول تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ الگ الگ حرف لکھنے سے کمپیوٹر کو کون سی آسانی ہو جائے گی؟ کمپیوٹر غریب اردو کا نقاد تو ہے نہیں کہ عقل سے عاری ہو۔ وہ تو ایک بہت ہی نازک اور حساس مشین ہے جو سکھائے گا سیکھ لے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ کمپیوٹر جب اردو فارسی عربی لکھتا ہے تو اسے معلوم رہتا ہے کہ یہ انگریزی یا فرانسیسی نہیں ہے، اور اس میں مجھے بڑی مشکل ہونا چاہیے۔ کمپیوٹر تو حکم کا بندہ ہے۔ اس میں اقتداری فیصلے کی صلاحیت نہیں۔ لیکن بنیادی سوال یہ کہ اردو میں حرفوں کو الگ الگ کیوں نہیں لکھا جاتا، جب کہ مثلاً رومن اور ناگری میں ایسا ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن زبانوں میں حرف الگ الگ لکھے جاتے ہیں تو ان میں اعراب بالحرف یا اعراب صریح، یا موقعے موقعے سے دونوں کا التزام ہوتا ہے۔ موخر الذکر کو سنسکرت/ ہندی میں ''ماترا'' کہتے ہیں۔ اعراب بالحرف کے لیے وہاں شاید کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں کے عمل کو یوں واضح کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ نے اردو میں لکھا:

ہم

اب آپ سے کہا گیا کہ اچھا اس کے حرف الگ الگ کر کے رومن رسم خط میں لکھیے، جس طرح انگریزی لکھی جاتی ہے۔ تو آپ نے لکھا:

HM

اب ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا پڑھیے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی میں کوئی لفظ اس قماش کا ہے ہی نہیں جس میں صرف یہ دو حرف ہوں۔ لامحالہ آپ کہیں گے، ''لفظ ''ہم'' کے اعراب کیا ہیں؟ یہ معلوم ہو تبھی تو انگریزی میں لکھوں گا۔'' آپ کی بات وزنی ہے، لہٰذا آپ کو بتایا گیا کہ یہاں ''ہم'' میں اول مفتوح ہے۔ ''بہت خوب، ابھی لیجیے'' آپ نے جھٹ کہا اور لکھا:

HAM

اس بات سے قطع نظر کہ لفظ Ham کے انگریزی میں کئی معنی ہیں، اور ایک بھی معنی اردو لفظ ''ہم'' کے معنی سے مطابقت نہیں رکھتے، آپ یہ ملاحظہ کریں کہ پڑھنے/سیکھنے والے کو کتنی مشکل ہوگی (اور آپ کے کمپیوٹر غریب کو شاید کتنی ''مشکل'' ہوگی) جب یہ لفظ:

ہم

رومن رسم خط میں، اردو رومن طرز کے مطابق، حرف الگ الگ کر کے لکھا جائے گا؟ اگر آپ اعراب بالحرف نہ دیں گے تو کوئی پڑھ ہی نہ سکے گا کہ لکھا کیا ہے؟ اردو میں تو رسم بن چکی ہے، پڑھنے والے کو معلوم ہے کہ شروع شروع کی اکا دکا منازل کے بعد اعراب صریح (زیر، زبر، پیش) میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا مجھے خود ہی معلوم کرنا ہے کہ مثلاً حسب ذیل شعر میں الفاظ پر اعراب کیا ہیں:

کئی گزرے سنہ ترا کم تھا سن جو لیے تھے سن ترے گھونگرو
گیا سینہ چھن گئے ہوش چھن جو بجے تھے چھن ترے گھونگرو

چنانچہ جب میرا سابقہ اردو زبان اور رسم خط میں لفظ ''ہم'' سے پڑا تو میں نے یہ پکار نہ لگائی کہ ارے بھائی اس پر اعراب کیا ہیں؟ میں نے خود کو سکھا لیا ہے کہ یہاں اول حرف پر تین میں سے ایک حرکت ہوگی، اور مجھے قیاس اور تجربے سے کام لے کر معلوم کر لیتا ہے کہ اس وقت کون سی حرکت ہے۔ اگر مجھے صرف HM دکھایا جائے گا تو میں مرتے مرتے مر جاؤں گا لیکن مجھے اعراب نہ ملے گا۔ اچھا اگر یہ طے کر لیں کہ میاں جس طرح اردو میں انکل سے پڑھتے ہو، اسی طرح رومن میں انکل سے پڑھ لو۔ جان لو اس زبان میں اعراب بالحرف نہیں ہیں۔ اس پر التمس یہ ہے کہ کیا معنی، اردو زبان میں اعراب بالحرف نہیں؟ تو پھر اسی لفظ ''نہیں'' میں ہائے ہوز کے بعد کیا ہے؟ حرف دوم یہاں مکسور ہے اور حرف سوم پر کوئی حرکت نہیں، وہ لمبی ای کی آواز ظاہر کر رہا ہے، کہنے کو چھوٹی 'ی' ہے۔ یہ اعراب صریح ہے، یعنی کسی حرف کو علامت میں بدل کر اس سے اعراب کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہی چھوٹی 'ی' جب لفظ ''ایدھر'' میں آئے گی تو اور طرح لکھی جائے گی، جب لفظ ''پہلی'' میں لکھی جائے گی تو اور طرح لکھی جائے گی۔ اب ذرا ''بانگ درا'' کا پہلا مصرع حرفوں کو الگ الگ کر کے رومن طرز میں صرف اردو کے اعراب کے مطابق لکھیے:

اے ہ م ال ہ اے ف ص ی ل ک ش و ر ہ ن د و س ت اں میں نے لفظوں کے درمیان فاصلے رکھے ہیں، لیکن کوئی بندہ خدا اس مصرعے کو پہلے سے اردو میں پڑھے بغیر پڑھ ہی دے تو دیکھوں، صحیح اور موزوں پڑھنا تو دور رہا۔ کہیں پر اعراب غائب ہیں، کہیں اعراب صریح ہے، لیکن پھر بھی مبہم (مثلاً پتہ نہیں چلتا کہ ''ہندوستاں'' میں واؤ معروف ہے کہ مجہول؟)

معلوم ہوا اردو میں کہیں کہیں اعراب صریح ہے، زیادہ تر فقدان اعراب ہے، اور جہاں اعراب ہیں وہاں اکثر مبہم ہیں۔ ایسی زبان کو آپ انگریزی کی طرح الگ الگ حرفوں اور التزام اعراب کے ساتھ کس طرح لکھیں گے؟

ایک بات اور بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انگریزی میں اعراب بالحرف بالکل نہیں ہے۔ اور نہ ایسا ہے کہ اعراب بالحرف کی امداد سے تلفظ قطعی اور واضح ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں جہاں جہاں (مثلاً) حسب ذیل حرف آخر لفظ میں ساتھ آتے ہیں، وہاں اعراب بالحرف ہے:

BLE (a BLE); DLE (bun DLE); GLE (buGLE); KLE (tacKLE)

مگر مشکل یہ ہے کہ ان تینوں میں حرف ا، اور اس کے ماقبل کے درمیان حرکت یکساں نہیں ہے۔

Table میں b اور L کے بیچ میں ہلکا سا ضمہ ہے۔

Bundle میں d اور L کے بیچ میں ہلکا سا کسرہ ہے۔

Bundle میں b اور L کے بیچ میں کچھ نہیں ہے، فتحہ مان سکتے ہیں، لیکن وہ اس قدر ہلکا ہے کہ ہونا نہ ہونا مساوی سمجھیے۔

Tackle میں k اور L کے بیچ میں بہت ہلکا سا ضمہ ہے، ذرا کسرہ کی طرف مائل۔

لہٰذا وہاں بھی تلفظ کی مشکلیں اعراب کے ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر ہیں، خواہ حرف کتنی ہی دور دور کیوں نہ لکھے جائیں۔ انگریزی کی نقل کرنے سے یہاں اردو کو کچھ نہ ملے گا۔ خلیل دھن تیجوی کی یہ بات باوزن ہے۔ ''اگر غیر اردو داں طبقہ بھی اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیتا ہے تو اردو کی آبیاری کرنے والوں کے بچوں کو [یہ کام] کیوں نہیں سکھایا جا سکتا؟'' ہم اردو والوں کی یہ ادا خوب ہے کہ جس درخت سے پھل حاصل کرنا مشکل نظر آئے، اس درخت کی جڑ ہی کاٹ دینے پر تل جائیں گے، خود تھوڑی سی محنت نہ برداشت کریں گے۔ اسی طرح، رام پرکاش کپور نے بھی یہی بات کہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم لوگوں کو خود بینی سے فرصت ہی نہیں کہ ان الفاظ کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں:

"اردو کی لڑائی خود ان لوگوں سے ہے جو اردو بولتے ہیں، اردو کے مشاعرے پڑھتے ہیں، اردو کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں، اردو کے نام کی روٹی کھاتے ہیں، اردو کے کارواں کو چلاتے ہیں اور کبھی کبھی اردو کو سرکاری زبان بنا دینے کی مانگ کرکے عوام کو گمراہ بھی کرتے ہیں۔ اردو میں فلمیں لکھ کر ہندی کے نام سے بیچتے ہیں۔ اردو کے گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ برداشت کرتے ہیں۔ ان تمام بڑے بڑے اردو داں حضرات کے بچے اردو نہیں پڑھتے، نہیں بولتے نہیں لکھتے، نہیں جانتے۔ نہ ہی خود یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اردو جیسی زبان سیکھیں۔"

گذشتہ چالیس برس سے میں اردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور پروفیسروں کی خدمت میں حاضری دیتا رہا ہوں، اور میں نے حتی المقدور اس بات پر ٹوکا بھی ہے کہ آپ کے بچے، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اردو نہیں پڑھتے۔ یہ اچھی بات نہیں، اور کچھ نہیں تو یہ خیال فرمائیے کہ آپ کی تحریروں سے آپ کے اخلاف محروم رہیں گے، یہ منصفی سے عاری ہے کہ نہیں؟ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اکا دکا کے سوا کسی کے کان پر جوں نہ رینگی اور یہی لوگ ہیں جن کی صدائے ماتم سب سے زیادہ بلند سنائی دیتی ہے کہ ہائے اردو مرگئی، یا مر رہی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، انھیں نے اپنے گھر سے اردو کو بدر کر دیا ہے، اس لیے وہ یہی کہنے میں عافیت سمجھتے ہیں کہ اردو کا خاتمہ ہوگیا، یا ہونے والا ہے۔

حقیقت، ظاہر ہے کہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ لیکن اردو کی بقا کے لیے سب سے زیادہ تعاون اور قربانیاں غریب غربا کی طرف سے، یا پھر ان علاقوں سے آئی ہیں جنھیں ہم یوپی والے اردو کے علاقے نہیں سمجھتے، اور وہاں کے اردو بولنے والوں کو "اہل زبان" نہیں تصور کرتے۔ اردو کے لیے سعی اور جہد سب سے زیادہ بہار میں کی گئی اور کی جارہی ہے۔ پھر مہاراشٹر میں، جہاں اردو مخالف حکومتوں کے باوجود اردو ذریعۂ تعلیم کی درس گاہیں خوب برگ و بار لا رہی ہیں اور اردو میڈیم سے تعلیم پائے ہوئے بچے مسلسل ہائی اسکول کے امتحان میں سارے صوبے میں پہلی پوزیشن لاتے ہیں۔ یوپی والے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اردو پڑھنا چھوڑ دیا تو سب نے چھوڑ دیا۔ وہ بہار اور مہاراشٹر کیا، مدھیہ پردیش، کرناٹک، آندھرا، ہماچل پردیش جاکے دیکھیں تو انھیں معلوم ہو۔ یوپی والے اپنے گلے میں "اہل زبان" کا تمغا لٹکائے رہیں اور سمجھتے رہیں کہ اردو کا قتل ہو چکا۔ دنیا ان پر ہنس رہی ہے، ابھی اور ہنسے گی۔

رام پرکاش کپور نے اپنی تحریر مطبوعہ "شاعر" ممبئی میں ہاشم علی اختر صاحب (سابق وائس چانسلر، عثمانیہ یونیورسٹی، اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی) کا حوالہ دیا ہے کہ ان کے دوستوں، رشتہ داروں میں "چالیس کی عمر سے کم والا ایک بھی فرد اردو رسم الخط نہیں جانتا"، لہٰذا ہاشم علی صاحب چاہتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے یہ تو ایسا ہی ہوا کہ اگر کسی معاشرے میں چالیس سے کم عمر والے افراد جاہل ہوں تو ہاشم علی صاحب کی منطق کے مطابق اس معاشرے میں خواندگی (Literacy) کو منسوخ قرار دیا جائے اور اس کو "زبانی" (Oral) معاشرے کی سطح پر قائم کیا جائے۔ اور اگر کسی معاشرے میں چالیس سے کم عمر والے افراد کو کوئی بیماری ہے تو اس بیماری کا علاج کرنے کے بجائے اسے نارمل حالت صحت قرار دیا جائے اور سب لوگوں کے لیے اس بیماری میں مبتلا ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

میں کئی گزشتہ تحریروں میں رومن اور ناگری رسم الخطوں کی کمی اور کمزوریاں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، لہٰذا یہاں ان باتوں کا اعادہ نہیں کرتا۔ یہاں آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت سے مراعات کی بھیک مانگنے کے بجائے ہم اردو والوں کو خود اپنی زبان کے فروغ اور استحکام کی کوشش کرنا چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ حکومتوں نے جتنا کیا ہے اور جو کر رہی ہیں، اس سے زیادہ کی امید آپ کو کیوں ہو؟ خود ہمارا بھی کچھ فرض ہے کہ نہیں:

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر حاجتے پیش سلیماں نے مبر

(بشکریہ "شب خون"، جون تا دسمبر 2005 حصہ اوّل)

□□□

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں "پس نوشت: آج یہ کتاب" کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

علی رفاد فتیحی

اردو لفظیات پر انقلاب 1857 کے اثرات

ہندوستان جیسے کثیرلسانی ملک میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اردو کی لسانی اور تہذیبی بنیادوں کی بازیافت ہندوستان کے تاریخی پس منظر میں ازسرنو کی جائے۔ یورپی نوآبادیاتی فکر کے لیے اردو وحدت کی علامت ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مخاصمت کا ہدف تھی۔ نوآبادیاتی قوتیں اپنی طاقت کا فروغ چاہتی ہیں چنانچہ نوآبادیاتی نظام میں لسانی علمی اور ثقافتی استحصال ناگزیر ہوجاتا ہے۔ برصغیر پر انگریزی تسلط کے خلاف 1857 کی بغاوت نے انگریزوں کو یہ باور کرادیا تھا کہ اتحاد کی موجودگی میں ان کے لیے اس خطے میں اپنی حکومت کو استحکام عطا کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مختلف سطحوں پر ایسی سازشیں کیں جن سے اس خطے کی سالمیت' اتحاد اور وحدت و ہم آہنگی کا قلع قمع ہوجائے۔ ان کی ان کوششوں میں اردو بطور خاص عتاب کا نشانہ بنی۔ یوں تو 1857 کے قومی انقلاب سے قبل بھی ملک کے آدی واسیوں' کسانوں' مزدوروں اور دستکاروں نے سامراجی حکومت کے آمرانہ طور طریقوں کے خلاف تحریکیں چلائی تھیں اور کچھ علاقائی حکمرانوں نے بھی بغاوت کا پرچم بلند کیا تھا لیکن 1857 کی ملک گیر بغاوت نے جو قومی سطح کی سوچ اور سیاسی بیداری پیدا کی اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران انگریزوں کی جانب سے کیے جانے والے جبروستم کے خلاف عوامی غم وغصہ کے اظہار کا عکس اردو زبان کی لفظیات میں بخوبی نظر آتا ہے کیونکہ 1857 کی ملک گیر بغاوت نے جو قومی سوچ اور سیاسی بیداری پیدا کی تھی اس کا سیدھا اثر اردو زبان کی لفظیات پر پڑا۔ زیرنظر مقالے میں 1857 کے دوران انگریزوں کی جانب سے کیے جانے والے جبروستم کے خلاف اردو زبان میں عوامی غم وغصے کے اظہار کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سرنگاپٹنم میں ولزلی کی چڑھائی کے زمانے سے ظہور پذیر ہونے والے واقعات کے تسلسل کا تجزیہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ 1806 میں ''ویلور'' کی بغاوت سے لے کر 1857 تک انگریزوں کی جانب سے کیے جانے والے جبروستم کے خلاف عوامی غم وغصہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ 1857 کے سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی کے اندھیرے میں نوآبادیاتی نظام اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جمارہا تھا اور ہندوستان کی لوٹ سے اپنے صنعتی انقلاب کو مضبوط کررہا تھا۔ اس کا حوالہ مصحفی کے اس شعر میں بخوبی ملتا ہے:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

1857 کی جنگ آزادی گو مبہم، غیر متعین اور غیر منظم تھی لیکن شدید قومی جذبے نے اس میں شدت پیدا کی تھی۔ اس تحریک میں ملک کے مختلف طبقوں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے حصہ لیا، ان میں کسی قسم کا تنظیمی اتحاد نہ تھا اور یہی چیز ناکامی کا باعث بنی۔ بغاوت فوج نے شروع کی تھی لیکن فوج کے علاوہ سابق حکمراں طبقہ، ملازمت پیشہ اور علما سب اس جنگ آزادی میں شریک ہوگئے تھے۔ یہ تمام گروہ انگریزوں کو ملک سے نکالنا چاہتے تھے۔ غالب کے خطوط اور ''دستنبو'' میں ایسی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1857 کی بغاوت دراصل عوامی بغاوت تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

(1) ''جب انگریزوں نے عوامی فوج کے ہاتھوں سے شہر چھین لیا تو عام لوگ باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہوگئے اور گلی گلی میں لڑنے لگے۔ دو تین دن تک کشمیری دروازے سے آگے شہر کا گوشہ گوشہ بیچ بیچ میدان جنگ بنا رہا اور باہر جانے کے تین راستے یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ باغی فوجیوں کے ہاتھ میں رہے''

مذکورہ بالا اقتباس کے تجزیے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ 1857 کی جنگ آزادی کا رنگ وروپ عوامی تھا اور اس میں عوام شریک تھے۔ یہ صرف فوجیوں کا برپا کیا ہوا ہنگامہ وآشوب نہیں تھا۔ عوام نے آخری وقت تک دلیرانہ اور مدافعانہ جدوجہد کی اور اجمیری دروازہ اور ترکمان دروازہ سب رزم گاہ میں تبدیل ہوگئے تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد دلی شہر خموشاں میں تبدیل ہوگئی اور پوری مسلم آبادی شہر بدر کردی گئی تھی (شہراز مسلمانان تہی است، شبانہ، خانہ ہائے این مردم بے چراغ وروزانہ روزن دیوار ہا بے دود)

(2) ''ہزار ہا دوست مرگئے کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں''

بہادرشاہ ظفر کی وفات کا ذکر غالب نے ان الفاظ میں کیا: ''7 نومبر 1862 مطابق جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر قید فرنگ اور قید جسم دونوں سے آزاد ہوگئے اناللہ وانا الیہ راجعون''

ان اقتباسات میں جو درد اور یاس کی کیفیت ہے اس کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔ سرسید کی کتاب ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر میں انگریزی تسلط کے خلاف عوام میں غم وغصہ اپنے عروج پر تھا اور اس سے ان کی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہورہا تھا۔ انگریزوں کے خلاف انفرادی ناپسندیدگی آہستہ آہستہ اجتماعیت کی شکل لیتی جارہی تھی۔ یہ سب کچھ نفسیاتی اعتبار سے تحت الشعوری اور بعض

مرتبہ شعوری طور پر ہو رہا تھا۔ اجتماعی فکر اپنی مکمل ترسیل کے لیے نئے لفظ وضع کر لیتی ہے جو اس اجتماعی فکر کی ترسیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اجتماعی کوششیں لسانی صداقت سے آگاہ اور ان کی مدد سے انوکھے لسانی پیکر تراشنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ 1857 کے فوراً بعد اردو زبان کی لفظیات کے تجزیے سے عوام کی لسانی سوجھ بوجھ لسانی روایت سے واقفیت اور زبان کے جسارت آمیز شعور کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ یوں تو زبانوں کے ارتقا میں اقوام کے اختلاط و ارتباط کا بڑا دخل ہوتا ہے لیکن 1857 کے بعد نئی سماجی اور ذہنی تبدیلیوں کے مطابق نئے الفاظ کے ذریعے انگریزی تسلط کے خلاف عوامی اظہار کی کوشش اردو میں نمایاں نظر آتی ہے اور اس غم و غصے کے اظہار کے لیے نئے لفظی سانچوں کی تلاش جس حد تک اردو میں نظر آتی ہے شاید ہی کسی اور زبان میں ملتی ہو۔

نئے لفظی سانچوں کی تلاش کے پس پردہ وہ آرزومندی ہے جو نئے عہد کی تلخیوں کو فنا کر دینا چاہتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ خود کو تاریخ کی بندشوں سے آزاد کرنے کی جستجو ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت کو زیرنگیں کیے جانے کی وہ کوشش ہے جس سے اپنے وجود کے معنی کی دریافت ممکن ہو سکے۔ یہ انداز نظر الفاظ کو نئی معنویتوں کا حامل بنا دیتا ہے۔ نئے تجربے کی شمولیت ذہنی حقیقتوں کو نئے مفہوم سے ہمکنار کرتی ہے جس کی وجہ سے ان حقیقتوں کی جانب رویے تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس طرح الفاظ نئی معنویت سے روشناس ہوتے ہیں۔

اس پس منظر میں اردو کے بعض الفاظ کے محرکات کا سراغ لگانا دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ الفاظ اشتقاقی لحاظ سے بھی قابل توجہ ہیں کیونکہ قیاسی اشتقاق غلط یا صحیح سمت میں ہو سکتا ہے لیکن اس کی صحت کا دارومدار تاریخی واقعات اور صوتی تغیرات کے قرین قیاس ہونا چاہیے۔ اردو صرف میں ایک اہم حصہ ''تفریس'' اور ''تعریب'' کے اصولوں کا ہے اور ان سے الفاظ کا ایک زبان سے دوسری زبان میں دخیل ہونا ثابت ہوتا ہے، مزید یہ کہ ان صرفی تبدیلیوں کی بدولت معنوی تغیرات پیدا ہوتے ہیں جو الفاظ کو ان کی اصل سے دور یا دور تر لے جاتے ہیں۔ صرفی اصول قیاسی فیصلے میں ہمارے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح صرفی اصول کسی بھی لفظ کی اصل دریافت کرنے میں ہمارے رہبر ہو سکتے ہیں۔ ان لسانی حقائق کے پس منظر میں اس مضمون میں اُردو میں مستعمل بعض الفاظ کی صرفی ساخت اور معنوی جہت کو تاریخی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ الفاظ کی نئی معنویت کو اس آرزومندی سے جوڑا جا سکے جو 1857 کی تلخیوں کو فنا کر دینا چاہتی تھی۔ مثلاً اُردو میں مستعمل لفظ ''انگریز'' پرتگالی لفظ انگلیز (Ingles) سے وضع کیا گیا ہے اور اس لفظ سے اُردو میں کئی لفظ وضع کیے گئے ہیں جو مندرجۂ ذیل ہیں:

انگریزن ۔ انگریزی ۔ انگریزنی ۔ انگریزی پتی ۔ انگریزی داں ۔ انگریزی گز۔ انگریزیت۔

ان الفاظ کی تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ الفاظ معنوی پستی کے مظہر ہیں۔ ان الفاظ میں معنوی پستی دراصل ایک تاریخی حقیقت کو زیر نگیں کیے جانے کی شعوری یا لاشعوری کوشش سے آئی ہے۔ مثلاً لفظ انگریزن کو دیکھیے، یہ لفظ انگریز + لاحقۂ تانیث ''ن'' کی مدد سے بنا ہے۔

اس لفظ کے تجزیاتی مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصلاً جو کچھ بھی ہو لیکن استعمال میں اس کے معنی کی پستی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے مثلاً ''پس پردہ'' سے لیا گیا یہ جملہ دیکھیں:

''انگریزن کہیں کی، ذرا شرم نہیں'' (پس پردہ، صفحہ 153)

تنزل معنی کی یہ کیفیت ''انگریزی'' اور ''انگریزیت'' میں بھی نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اور جملوں میں ان لفظوں کے استعمال میں تحقیر کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے:

(1) پہن کر کپڑے انگریزی میاں خوش رو نکلتے ہیں
نئے موتی محل سے بن کے اب لولو نکلتے ہیں (جان صاحب)

(2) کنارہ کیجیے گا صحبت رندان کالج سے
غضب ہی ڈھائیں گے اے شیخ یہ پڑھے ہیں انگریزی
(گلکدۂ عزیز)

(3) ''میرے خیال میں ترجمے کے لیے اگر ایسی نظمیں چنی جاتیں جن میں انگریزیت کم ہوتی تو وہ زیادہ اچھا ہوتا'' (خطبات گارساں دتاسی)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات معنوی تنزل مستقل ہوتا ہے جبکہ بعض مثالوں میں مخصوص سیاق میں معنی کی پستی واقع ہوتی ہے۔ مندرجۂ بالا مثالوں میں معنوی پستی نمایاں ہے لیکن ممکن ہے کہ دوسرے سیاق میں یہ معنوی پستی نمایاں ہو کر ہمارے سامنے نہ آئے۔ معنوی پستی کی مثال لفظ ''انگلش'' سے مشتق الفاظ میں بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً اِنگلس ۔ انگلسیا۔ انگلیشیا وہ الفاظ ہیں جو اشتقاقی لاحقوں کی مدد سے وضع کیے گئے ہیں۔

''اِنگلس'' کی اصطلاح دراصل اس پنشن یا وظیفے کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے جو ایام ملازمت کی کارگزاری کے صلے میں انگریزی حکومت ہند سے اپاہج یا بوڑھے ہو جانے پر ملتی تھی۔ اس طرح ''انگلسیا'' کی اصطلاح برصغیر میں حکومت برطانیہ کے اس پنشن خوار سپاہی کے لیے استعمال ہوتی تھی جو کار سرکار میں اپاہج یا زخمی ہو جاتے تھے۔ اسی طرح اپاہج پنشن خوار سپاہی کے لیے ''انگلیشیا'' کی ترکیب بھی رائج تھی۔ ان تمام الفاظ میں تضحیک کا پہلو واضح طور پر نظر آتا ہے۔

تنزل معنی اور تضحیک کا یہ رنگ لفظ ''فرنگ'' میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ لفظ عام طور سے زبانوں پر بکسر اول ہے۔ صاحب نور اللغات لکھتے ہیں کہ اصل میں یہ لفظ ''فرینک'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ''فرینک'' جرمن کی ایک قوم کا

نام تھا جس نے پانچویں صدی عیسوی میں "فرانس" کو فتح کیا۔ اردو میں کنایۃً سفید اور گوری نسل کے لوگوں کو کہتے ہیں۔ انگریزوں کے غلبے سے پہلے اس لفظ کا استعمال ایک خاص طرح کی فولاد کی بنی ہوئی سیدھی کاٹ کی آسانی سے گھونپ دی جانے والی تلوار کے لیے ہوتا رہا ہے، مثلاً ان اشعار کو دیکھیں:

اشارت میں دو ابرو بولتے تھے
فرنگاں ہات میں لے تولتے تھے

فرنگ میان تے کاڑی شہہ جان یوں
نکلا ہے کینچلی میں تے سانپ جیوں

غالباً یہ لفظ "فرنج" کی مفرس شکل ہے لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد یہ لفظ بمعنی "انگلستان" کے استعمال ہونے لگا:

سب چمن اپنے اپنے رنگ کے ہیں
پھول کچھ چین، کچھ فرنگ کے ہیں

آہستہ آہستہ لاحقہ نسبت "ی" کے اضافے کے ساتھ (فرنگ +ی=فرنگی) کا استعمال بمعنی "انگریز" یا "گورے" چمڑی والی یورپی قوم کے لیے رائج ہوگیا:

روایت ہے واں اِک فرنگی بھی تھا
ہوا گوش زد اس کے یہ ماجرا (میر 1810)

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں (اقبال)

اور پھر فرنگی میں لاحقۂ نسبت و تمیز "آنہ" کے اضافے کے ساتھ "فرنگیانہ" کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ فرنگیانہ دراصل صفت ہے جو "فرنگیوں کے طرز کے معنوں میں مستعمل ہے مثلاً:

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

اسی طرح لفظ "فرنگن" کا استعمال بمعنی انگریز عورت یا یورپ کی عورت کے ہوتا ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں اس لفظ کا استعمال دیکھیے:

ہے فرنگن کے گورے ہاتھ میں دل
جان کا صاحبو خدا حافظ

ان تمام مثالوں میں معنوی پستی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ گویا یہ تمام مثالیں معنوی پستی کی عمدہ مثالیں ہیں جو کہ غالباً اس جابرانہ انداز اور ظلم و تشدد کی دین ہے جو برطانوی ریزیڈنٹ عوام اور رجواڑوں کے ساتھ کرتے تھے۔ انگریز عہدیدار ریاستی حکومتوں کے ساتھ نہایت حقارت کا سلوک کرتے تھے اس لیے غم و غصے کا پنپنا فطری تھا۔ لہٰذا انگریزوں کے لیے مستعمل اردو الفاظ میں تضحیک و تذلیل کا پہلو ابھر آنا کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں ایک لفظ "کارستانی" کو دیکھیں۔

فرہنگ آصفیہ میں اس لفظ کے معنی "چالاکی، عیاری، جوڑ توڑ سازش، فتنہ انگیزی درج ہیں۔ اس لفظ کے سلسلے میں مولوی سید احمد دہلوی مزید لکھتے ہیں کہ یہ لفظ "کارستاں" بمعنی کارخانہ یا کارگاہ سے لیا گیا ہے۔ اس لفظ میں اگر ہم علامتِ ظرف "ستاں" پر توجہ صرف کریں تو لفظ اپنے معنی سے دور ہوتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا قیاس یہ ہے کہ یہ لفظ "کرستان" سے مشتق ہے۔ کرستان انگریزی لفظ Christian کا خالص اردو لہجہ ہے جہاں قریب المخرج اصوات کا استعمال ہوا ہے۔ لاحقۂ نسبت "ی" کی مدد سے یہ لفظ کرستانی یا کارستانی میں تبدیل ہوا۔ یعنی یہ لفظ ان عیسائی مبلغوں کی نشاندہی کرتا ہے جو پوشیدہ طریقوں سے تبلیغ عیسائیت کرتے تھے۔ اس طرح اس لفظ کو اگر ہم قیاسی اشتقاق کے اصولوں پر پرکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید حضرت عیسیٰ کے اسم مبارک "Christ" میں علامت نسبت "ian" اور اردو علامت نسبت "ی" کے الحاق سے یہ لفظ تشکیل پایا ہے۔ بہر کیف یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ صرف ایک قیاس ہے اور کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے کے لیے تحقیق لفظ کے اصولوں پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر اس لسانی قیاس میں کوئی صداقت ہے تو یہ لفظ تنزل معنی کی ایک دوسری عمدہ مثال ہے۔

تقریباً یہی کیفیت محاوروں کی ہے۔ محاورہ زبان کا وہ سرمایہ ہے جو ہمیں ورثے میں ملتا ہے۔ 1857 کے واقعات نے اُردو کو اس حد تک متاثر کیا کہ اظہار کے نئے نئے سانچے وضع ہونے لگے اور الفاظ و محاورات کو زبان کا سرمایہ بنانے کی کوششیں تیز ہوگئیں۔ محاوروں میں الفاظ اپنے مجازی معنی میں مستعمل ہوجاتے ہیں۔ 1857 کے واقعات نے اُردو کو چند ایسے محاورے دیے جو آج بھی رائج ہیں، مثلاً "غدر کاٹنا، غدر برپا کرنا" اور "غدر مچانا"۔ اگر ہم ان محاورات کی ساخت پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان محاوروں سے مختلف ہیں جن میں "اسم" مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ ان محاوروں سے بھی مختلف ہیں جن میں مصادر مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان محاوروں میں اسماء و افعال دونوں مجازی معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ان محاوروں میں لفظ "غدر" اپنے اصل معنی سے الگ "شور و غل" یا "ہنگامہ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح مصادر "کاٹنا، مچانا، برپا کرنا" "کرنے" کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ان محاوروں کو مشاہداتی محاوروں کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے کیونکہ ان میں مشاہدے کے نتائج سے معنی کو وسعت دی گئی ہے۔ ان محاورات سے اُردو زبان پر 1857 کے اثرات کی ماہیت و حقیقت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ ان محاورات کی ساخت اور ان میں مستعملہ الفاظ ان تاریخی حقائق کو واضح کردیتے ہیں جن کا ذکر پہلے اوپر آچکا ہے۔

□□□

پتہ:
Department of Linguistics, AMU, Aligarh

انیس چشتی

اردو زبان کی تدریس میں ہمزہ کا تعین

ہم اردو والے ہمزہ (ء) کا بالعموم بے توجہی سے استعمال کرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر نہ تو فارسی سے واقف ہیں اور نہ ہی عربی زبان سے، اس لیے ہمزہ کے استعمال میں اکثر غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً ہمیں عبدالحی لکھنا ہو تو ہم اسے ''عبدالحیٔ'' لکھیں گے۔ یعنی ''ی'' پر ہمزہ لگا بیٹھیں گے اور اس لفظ کے معنی نعوذ باللہ'' بندۂ باحیا'' کے ہو جائیں گے۔

زبان دراصل کچھ اصوات (آوازوں) کا نام ہے۔ ان آوازوں کو خیالات کی ادائیگی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ آوازوں کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے ہر آواز کے لیے ایک علامت تجویز کر دی گئی ہے۔ یہی علامت آگے چل کر ''مجسمہ صوت'' یعنی حرف (Alphabet) یا کسی حرف کی شکل (Character) بن گئی۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہی حروف، مصوتے (Vowels) اور مصمتے (Consonants) کہلاتے ہیں۔ بعض حروف اپنے آپ میں دوسرے سے ملنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض نہیں رکھتے۔ جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے وہ جامد حروف یا حروف صحیح (Consonants) بھی کہلاتے ہیں اور وہ حروف جو پڑوسی حرف سے ملنے ملانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ حروف علت یا مصوتے کہلاتے ہیں۔ جیسے انگریزی حروف علت a, e, i, o, u ہیں۔ عربی حروف علت صرف تین ہیں ''واؤ، الف اور ی''۔ ان دنوں اردو رسم الخط کے ماہرین اس فہرست میں ''ے'' کا بھی شمار کرنے لگے ہیں۔ عربی یا اردو رسم الخط کا خاصہ یہ ہے کہ اس کا ہر حرف دوسرے میں ملنے کی صلاحیت رکھتا ہے، البتہ اس کے لیے اعراب (Short Vowels) کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اعراب کیا ہیں؟ دراصل صوتی بیساکھیاں ہیں جو ہر حرف کو عطا کی گئی ہیں۔ عربی حروف تہجی ان بیساکھیوں کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس کے حروف علت بھی ان کے سہارے کے بغیر دوسروں کے گھر اپنے پیروں پر چل کر نہیں جاسکتے۔ یہی اعراب کتابت یا تحریر کے دوران Diacritic Marks بھی کہلاتے ہیں۔ اسی صوتی تناظر میں اردو والوں نے ہندی اصوات بھ، پھ، تھ، کھ وغیرہ کو دو چشمی ''ھ'' لگا کر اردو الیا ہے، یہ علامات یا حروف ''مہتوتہ'' کہلاتے ہیں۔ یہاں اس کی مزید تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔

ہمارے بعض ماہرین املا زبان کی تطہیر اور اصلاح کے لیے مرور زمانہ کا انتظار نہیں کرتے۔ عالمی زبانوں نے کروڑوں الفاظ کو رد کیا ہے، خراد کیا ہے، امپورٹ یا ایکسپورٹ کیا ہے۔ امپورٹ کیے ہوئے الفاظ کو اپنے معنی اور لہجوں کا لباس پہنایا ہے۔ رد و قبول کے اس طویل عمل کے بعد کسی زبان کو درازیٔ عمر کی دعا لگتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جس زبان کا لفظ لیا جائے، جہاں تک ہو سکے اسی زبان کے صوتی آہنگ کے ساتھ اس کا املا بھی لکھا جائے۔

اس وقت اردو کو ای میل اور انٹرنیٹ پر پہنچائے جانے کا عمل جاری ہے۔ اس لیے کسی کیریکٹر (Character) کے ترک کر دینے کا مشورہ دینا آسان ہے، لیکن اس کو دوبارہ جاری کرنا دشوار ہوگا۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہمزہ کی ''نسل کشی'' سے پہلے اس کے وجود اور لسانی نظام کا تعین کر لیں۔ معروضات پیش خدمت ہیں:

1. بے صوت ہمزہ: اگر ہمزہ کو حروف تہجی کے ایک رکن کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حروف علت اور اعراب کے بعد ہمزہ اردو کی سب سے زیادہ استعمال ہونے والی علامت ہے۔ حروف تہجی میں، سوائے ہمزہ کے، ہر حرف کی آواز ملے ہے۔ مثلاً ج، ل، ک، م وغیرہ بالترتیب انگریزی کے J, L, K اور M وغیرہ کے انداز پر پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمزہ کی کوئی آواز ملے نہیں ہے۔ قدرت نے اسے پانی کی طرح بے رنگ کر دیا ہے۔ لیکن پانی ہی کی طرح ہر رنگ میں، ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ کے مصداق رکھا ہے۔ اس سے ہمیں کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

2. ہمزہ بحیثیت حرف علت، اضافت اور مصوتے کے: اعراب اور حروف علت کی طرح ہمزہ کی اپنی کوئی متحرک حیثیت نہیں۔ اس کی آواز کا بھی تعین نہیں۔ اگر اس پر زبر، زیر، یا پیش لگ جائے یا اس کا سابقہ تنوین (ً ٍ ٌ) سے پڑ جائے تو یہ بالکل الف کی طرح بولنے لگتا ہے۔ مثلاً ماشاء اللہ یا تائثف، ملاء اعلیٰ، بہاءالدین، ابتداءً، شئ، شیٔ وغیرہ وغیرہ۔ عربی والے تو زیر اور زبر کے لیے حتماً ہمزہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً انھیں لفظ املا لکھنا ہو تو 'املاً' اور اصغر لکھنا ہو تو ''أصغر'' لکھیں گے۔ عربی الفاظ میں ہر اس مقام پر ہمزہ استعمال ہوتا ہے جہاں ''الف'' کے بعد مزید ایک ''الف'' کی آواز مطلوب ہوتی ہے۔ اگر وہاں دو ''الف'' مع اضافت کے لکھ دیے جائیں تو شاید یہ املا غلط قرار پائے۔ مثلاً حائل (حاال)، قائم (قاام) نشأۃ الثانیہ (نش + أۃ + ثانیہ) وغیرہ۔

3. ہمزہ بحیثیت وصل و مربوطہ: ہمزہ دراصل ایک نہایت طاقتور علامت ہے۔ اصطلاحات سازی اور مرکب الفاظ میں اس کا عمل غیر معمولی ہے۔ یہاں یہ کبھی الف، کبھی یے تو کبھی اے (اضافت) کی صورت میں آشکار ہے۔ یہاں

اس کا عمل اتنا طاقتور ہے کہ وہ ہائے ہوز (ہ)، تائے تانیث اور تائے مربوط (ۃ)، "ی" اور "و" تک کی آوازوں کو بدل دیتا ہے۔ مثلاً، جلوۂ دلکش، سورۂ فاتحہ، اسوۂ حسنہ اور پھر بطورِ خاص یہ الفاظ دیکھیے: مؤلف، مؤرخہ وغیرہ۔ یہاں ہمزہ واؤ کو سکون میں تبدیل کر کے خود الف بن بیٹھا ہے۔

4. ہمزہ بحیثیتِ معاونِ جزم و سکون: ہمزہ مستقلاً جزم اور سکتہ و سکون کے لیے بھی مستعمل ہے۔ مثلاً رأس المال، تأثرات، شعراء یا امراء وغیرہ۔

5. ہمزہ بحیثیتِ رمز: ہمزہ "ع" کا مخفف یا رمز کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عیسوی لکھنا ہو تو سنہ لکھنے کے بعد ہمزہ (ء) یعنی سرِ عین لگا دیتے ہیں، اسی طرح علیہ السلام کے لیے بھی (ؑ) مستعمل ہے۔

6. ہمزہ بحیثیتِ عُشر و اعشاریہ: ایک اور رمز جس کی طرف ہمارے املا نگاروں نے توجہ نہیں کی وہ اعشاریہ (Decimal) کا مخفف سرِ عین ہے۔ یہ دراصل عشرۃ یعنی دس (10) کا مخفف ہے اور بطورِ رمز (Sign) کے استعمال ہوتا ہے۔ عربی رسم الخط میں اعداد نویسی کے دوران بھی دس کے لیے " " اس طرح کی علامت استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بھی دراصل سرِ عین ہی ہے۔ ریاضیات میں اعشاریہ نظام کے لیے ہمزہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر مجھے تیرہ اعشاریہ پچاس لکھنا ہو تو وہ اس طرح لکھا جائے گا، 13،50۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اردو ہندسوں (اعداد) کے درمیان نظامِ اعشاریہ (Decimal System) بتانے کے لیے (o) صفر یعنی Decimal Point کا استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ان کے مطابق تیرہ اعشاریہ پچاس اس طرح، ۱۳.۵۰ (13.50) لکھا جائے گا، جبکہ یہ عدد تیرہ ہزار پچاس پڑھا جائے گا۔

7. ایک اہم نکتہ: ہمزہ کی کتابت اردو میں دو طرح سے ہوتی ہے۔ نسخ اور نستعلیق میں جب ہمزہ بطورِ اعشاریہ (Decimal Point) کے لکھا جاتا ہے تو عین کا سر (ء) کی طرح خطِ ثلث میں لکھا جاتا ہے۔ لیکن جب یہی ہمزہ صورتِ الف، اضافت، اعراب، وصل، سکون، جزم یا سکتے وغیرہ کے لیے لکھا جاتا ہے تب اس کی شکل بدل جاتی ہے اور وہ یوں (ء) لکھا جاتا ہے جو خطِ رقاع سے مشتق ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ املا نویسی کی کسی کتاب میں نہ تو ہمزہ نویسی کے ان طریقوں یعنی اعشاریہ نظام اور ہمزہ کے دیگر استعمالات وغیرہ پر بحث کی گئی ہے اور نہ ہی کتاب کے مذکورہ بالا دو طریقوں (Character Forms) کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اردو زباندانی کی تدریس کے دوران ہمزہ پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

□□□

پتہ:
116, Sterling House, 1984,
Convent Street, Pune-411001

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آ رہی ہیں اسی قدر ہم میں نا آسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

آفتاب احمد آفاقی

سرسید کا تاریخی شعور

تاریخ بہ ظاہر ماضی کے واقعات کی روداد ہے، مگر اس کی حیثیت ماضی اور حال کے مابین ایک مسلسل جاری رہنے والے مکالمے کی ہے اور یہ اپنی اصل صورت میں تاریخ نگار اور واقعات کی باہمی اثر پذیری کے نتیجے میں بہ روئے کار آتی ہے۔ اس اعتبار سے تاریخ نویسی واقعات کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے اور ان کے محرکات اور حقیقی بنیادوں کا پتا لگانے نیز ان کی صحت مندانہ انداز میں تعبیر و ترجمانی کا عمل قرار دی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تاریخ کا مطالعہ زندگی کے جامع اور متحرک شعور اور حقائق کی نئی پہچان اور پرکھ کا محرک ہوتا ہے، یہ ماضی کے عرفان کے ساتھ حال اور مستقبل کا زیادہ بہتر شعور عطا کرتا ہے۔ تاریخ محض ماضی کے واقعات یا حالات کی کھتونی نہیں بلکہ معاشرتی اور تہذیبی اقدار کے تقابل کی ایک راہ ہے۔ مشہور ڈچ عالم Huizinga تاریخ کو Teleology سے تعبیر کرتا ہے یعنی کائنات کے تمام تغیرات کے پیچھے کوئی نہ کوئی غایت یا مقصد چھپا ہوا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تاریخ داں محض ''کیوں'' پر اصرار نہیں کرتا بلکہ وہ ''کدھر'' کی تلاش بھی کرتا ہے۔ وہ تاریخ کو ایک خاص مفہوم میں تسلسل اور ارتقا سے تعبیر کرتا ہے۔ جب ہم ماضی سے بے گانگی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور مستقبل سے وابستہ ممکنہ ترقیات کو فراموش کر دیتے ہیں تو مؤرخ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا اور زمانے کی بڑھتی ہوئی رو اور اس کے ارتقائی رخ اور رفتار کی طرف راغب کرتا اور انقلابی شعور سے بہرہ ور کرتا ہے۔

یہ امر ملحوظ ہے کہ ہم جسے حال یا لمحۂ حاضر کہتے ہیں وہ فرضی خط فاصل Imaginary dividing line ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے اتنے مربوط اور پائیدار ہیں کہ انھیں قطعاً ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا، کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کے واقعات، حالات اور سانحات ایک ایسی دستاویز مرتب کرتے ہیں جن کی روشنی میں مستقبل کے بہتر امکان کا یقین ممکن ہے۔

سرسید کے تاریخی شعور اور کارناموں اور ان کے افکار و خیالات کو تاریخ کے اسی وسیع تصور اور مفہوم کی بنیاد پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کے یہ الفاظ ان کی فکر کو واضح طور پر سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں: ''جب اپنے ہم وطنوں کے حال پر غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گذشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔''(۱)

اس اقتباس سے یہ اشارہ بدیہی طور پر ملتا ہے کہ وہ حال کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے کے لیے ماضی کا جائزہ لینا ضروری تصور کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ تاریخ نگار عصبیت سے پوری طرح پاک نہیں ہوتا، اس کے ہر دعوے میں ایک مخصوص تصور، عقیدے اور مقصد کی کارفرمائی ضرور ہوتی ہے۔

سرسید کی تاریخ نگاری بھی ایک مخصوص تصور اور مقصد کے تابع ہے، جس کی نمائندگی صرف ان کی تاریخی کتابوں سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی جھلک ان کی مذہبی، ادبی اور صحافتی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ان کی تعقل پسندی اور سائنسی توجہات انھیں اس باب میں اپنے پیش روؤں اور معاصرین پر بین تفوق عطا کرتی ہے۔

سرسید کے تاریخی تصور کا یہ بے حد اہم پہلو ہے جو علی گڑھ تحریک، سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کے پس پردہ واضح طور پر کارفرما ہے اور جو ان کی ہمہ گیر علمی، تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی خدمات کے طاقتور محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ان کے اسی تاریخی اور عقلی تصور اور شعور کا نتیجہ تھا کہ ان کے اندر قومی اور تہذیبی سرمایے کی حفاظت اور اس کے ایک ایک نقش کو محفوظ کرکے آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ سرسید ماضی کو محض نقش کہن سمجھ کر نظر انداز کرنا درست تصور نہیں کرتے بلکہ حال اور مستقبل سے ناگزیر رشتے کا واضح احساس رکھتے ہیں، سرسید کے جملہ کارناموں میں یہی تصور کارفرما ہے، جو ان کے تاریخی شعور کی حقیقت اور قدر و قیمت کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔

سرسید کا دور جو انیسویں صدی کے نصف آخر پر مشتمل ہے، فکری اور تہذیبی سطح پر شکست و ریخت کا دور رہا ہے۔ انگریزوں کے تسلط اور جبر سے عوامی زندگی میں بے یقینی پیدا ہوچکی تھی، عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے مذہبی مباحثوں کے دروازے کھل گئے تھے، اسی دوران مناظرہ بازی اور مذہبی مدافعت کا رجحان بھی پیدا ہو، اور اصل اس صدی کے نصف اوّل ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مذہب کے متعلق نئی جستجو اور چھان بین کی ابتدا ہوچکی تھی۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی کی احیائی تحریکات کے ساتھ سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماجی تحریک جو اصلاً ویدک مذہب کے احیا کے لیے وجود میں آئی، کے ساتھ راجا رام موہن رائے کی ریڈیکل تنظیم ''برہمو سماج'' کا حوالہ دینا خصوصیت کے ساتھ ضروری ہے، جس نے حقیقت تک رسائی اور اس کے ادراک کے لیے سب سے بڑا ذریعہ ''عقل'' کو قرار دیا تھا۔ یہ واضح رہے کہ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات

نے اس رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ مغربی علوم اور افکار و خیالات نے ہمارے ذہن وفکر اور معاشرت وتہذیب پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا نے اس بدلتی صورت میں قوم کو ذہنی وفکری تربیت کی ایک نئی راہ دکھائی۔ اس ضمن میں شعروادب اور تاریخ وصحافت کے کردار کی بھی خاص اہمیت ہے جس کے بغیر سرسید کی وسیع تر قومی اغراض اور اصلاحی مقاصد پر مبنی کوششیں بار آور نہیں ہوسکتی تھیں۔ سرسید کی ادبی وعلمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ، سیاست، آثار قدیمہ، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ سب ہی اس میں شامل ہیں۔

سرسید کی تصنیفی زندگی کا آغاز 1848 میں ''آثار الصنادید'' سے ہوا جس کا امتیاز ان کی تاریخی تصانیف میں مسلم ہے۔ جو دراصل ان کی گہری سوچ اور بصیرت، ماضی کی صالح قدروں سے وابستگی اور تحفظ کے جذبے نیز اپنے اسلاف کے کارناموں کو نئی نسلوں میں منتقل کرنے کے جذبے کا اظہار کہی جائے گی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ عہد وسطی کی تاریخ کو ممتاز مورخ رومیلا تھاپر ''ہندوستان میں نئی ترقی کے عہد'' سے تعبیر کرتی اور مسلمانوں کے فنی شعور، ان کے ذوق جمال، جاہ وحشمت، تہذیب وتمدن اور ترقیات کی کھلی ہوئی شہادت بتاتی ہیں۔ اس پس منظر میں ''آثار الصنادید'' کے مطالعے سے مسلمانانِ ہند کی عظمت گذشتہ کی شاندار تصویر سامنے آتی ہے۔

''آثار الصنادید'' کے تین ابواب میں دہلی کی عمارتوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور آخری باب میں دہلی کے 120 مشاہیر کا، جن میں علما، صوفیا، اطبا، موسیقی داں، شامل ہیں مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔ بہ قول سرسید ''یہ وہ یادگاریں ہیں جو ہمارے بزرگوں نے بنائی تھیں جن سے ان کی شان وشوکت ظاہر ہوتی تھی، مگر اس زمانے میں وہ سب افسوس اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے کے لائق ہیں کہ ہم ایسے ناخلف ہوئے کہ ان کو قائم نہ رکھ سکے اور مٹا دیا، مجھے امید ہے کہ مسلمان اپنے بزرگوں کے ان ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کو دیکھیں گے اور روئیں گے کہ دارالسلطنت میں جہاں سالہا سال مسلمانوں نے بادشاہی کی وہاں مسلمانوں کے پاس حسرت اور افسوس کے سوا کچھ باقی نہیں۔''(2)

سرسید قدیم ہندوستان کے تہذیبی اور آثاری سرمایے کو بزرگوں کی کمائی تصور کرتے تھے۔ کہتے ہیں:

''کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔''(3)

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں آثار قدیمہ کی اہمیت کو سب سے پہلے سرسید نے محسوس کیا اور اس پر باقاعدہ تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ ان معنوں میں وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے آثار قدیمہ کے موضوع پر علمی اور محققانہ انداز پر کتاب لکھی اور تحقیق کے سلسلے میں انگلستان کا سفر کیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے فارسی ماخذ تاریخ کو ایڈیٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی''، ابوالفضل کی ''آئین اکبری'' اور جہانگیر کی تزک کی ترتیب و تدوین کے تاریخی شغف کا پتا دیتی ہیں۔ ''جام جم'' اور ''سلسلۃ الملوک'' گو صرف تالیفات میں شمار کی جائیں گی لیکن ان کی ترتیب میں انھیں خاصی محنت کرنی پڑی۔ ''جام جم'' تیموری سلسلے سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے جب کہ ''سلسلۃ الملوک'' میں دہلی کے ان سارے بادشاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں جن کا تاریخ میں تذکرہ ہے۔

''آثار الصنادید'' کے بعد تاریخ کے میدان میں سرسید کا زبردست کارنامہ ''تاریخ فیروز شاہی''، ''آئین اکبری'' اور ''تزک جہانگیری'' کی تدوین ہے۔ انھوں نے آئین اکبری کا ایک ایڈیشن نہایت اہتمام سے نکالا جس میں مغل زیورات کی تصویریں، خیمہ گاہ، پادشاہی اور تمام پھل دار اور پھول دار درختوں کی تصویریں شامل ہیں۔ ''تاریخ فیروز شاہی'' ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے زیر اہتمام 1862 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت کے بعد سے اب تک عہد وسطی کی ہندوستانی تاریخ کے سیکڑوں محققین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔(4)

''آئین اکبری'' کے متن کی تصحیح، اس کے مشکل مقامات کی وضاحت، عربی و فارسی، ترکی اور سنسکرت کی نامانوس اصطلاحوں کی تشریح اور بے شمار تصویروں کا اضافہ فن تاریخ سے سرسید کی غیر معمولی دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ 1857 کے بعد سرسید کا تاریخی اور سیاسی شعور زیادہ پختہ اور بالیدہ ہوکر سامنے آتا ہے، اس کی متعدد وجہیں بتائی گئی ہیں۔ احتشام حسین کے الفاظ میں:

''سرسید نے مغل حکومت کے چراغ کو بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مسلمانوں کی بدحالی اور زوال کا نظارہ کیا تھا، زمانے کی بدنظمی اور بدامنی کا مشاہدہ کیا تھا، غدر نے جس طرح رہی سہی آن بھی ختم کردی تھی اس نے ان کے قلب کو بے حد متاثر کیا اور ان میں جو علمی صلاحیتیں سو رہی تھیں وہ جاگ اٹھیں۔''(5)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید اس وقت مسلمانوں میں سب سے زیادہ جری، باعمل، دوربین اور عقل پرست تھے، انھوں نے شدت سے محسوس کیا کہ انگریزوں کے سیاسی تسلط کو روکنا یا چیلنج کرنا آسان نہیں ہے۔ سو غدر کے نازک پہلوؤں پر اپنا رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھا، ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں داخل ہونے کی یہ ان کی پہلی شعوری کوشش تھی۔ ہر چند کہ وہ سرکاری ملازم تھے، لیکن انھوں نے انگریزی حکومت کی چیرہ دستیوں کو بھی بے نقاب کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں نے بھی ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں کیا اس لیے وہ ان برکتوں سے حقیقتاً فائدہ نہ اٹھا سکے جو انگریزی حکومت اپنے ساتھ لائی تھی، انھوں نے ساری قوت اس پر صرف کردی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں قربت اور دوستی پیدا ہوجائے۔ وہ ہندوستانیوں کی

قومی، سیاسی، تہذیبی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے حاکم ومحکوم کے درمیان حائل منافرت ختم کرکے مصالحت کی صورت پیدا کرنا چاہتے تھے، تاکہ حکمراں قوم کی ترقی کے رازوں کا سراغ لگا کر، ان وسائل اور ذرائع کو اپنا کر ترقی کے مسدود دروازوں کو کھولا جا سکے، بالخصوص مسلمانوں میں وہ عقل اور فہم وفراست کی بنیاد پر ایک نئے نظامِ حیات کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جسے بعض ناقدین انگریزی حکومت سے وفاداری قرار دیتے ہیں، (6) اور اس سے یہ نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے، مگر اصلیت یہ ہے کہ انھوں نے خالص قومی مفاد کے پیش نظر یہ رویہ اختیار کیا۔

1857 میں انگریزوں کے عتاب کے شکار زیادہ تر مسلمان ہوئے تھے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ جواہر لعل نہرو کا خیال ہے کہ ''مسلمان مقابلتاً ذرا زیادہ جارح اور لڑاکو سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو زیادہ سختی سے دبایا۔''(7)

سرسید نے بہ یک وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے آواز بلند کرنے کی بہ جائے محض مسلمانوں کے حقوق کو پیش نظر رکھا بھی تھا تو اس کے پس پردہ انگریزوں کی سیاسی شعبدہ بازی کا بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا۔ اس سلسلے میں امبیکا چرن مجمدار اپنی کتاب "Indian National Evaluation" میں لکھتے ہیں کہ ''اوّل اوّل انگریزی عملداری کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش و عداوت کا موجب ہوا'' جیمس او کیلی ''کلکتہ ریویو' میں لکھتے ہیں'' ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد تھی۔ سالہا سال سے مسلسل ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا انھیں ایسی رعایا سمجھا جا رہا ہے جن کی اطاعت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لیے تھیں دوسرے کاموں میں صرف کیا جا رہا ہے۔''(8)

سرسید کی سیاسی زندگی میں تعصب یا تنگ نظری کو دخل نہ تھا یہ اور بات ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں غیر متوازن صورت حال کی وجہ سے مذہبی اختلاف کے جراثیم پرورش پا رہے تھے۔ سرسید پہ اس طرح کا الزام لگانے سے قبل ان کے نقطۂ نظر میں آنے والی تبدیلی کے محرکات کا پتا لگانا چاہیے، جن کا ذکر مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب ''حیات جاوید'' میں بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔

یہاں ''تاریخ سرکشی بجنور'' کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس میں مئی 1857 سے اپریل 1758 تک ضلع بجنور میں واقع غدر کے حالات درج ہیں۔ اس زمانے میں سرسید ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر امین کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔ اس تاریخی تصنیف کے محرکات پر سرسید نے کوئی روشنی نہیں ڈالی، ممکن ہے کہ اس کا مقصد جذبۂ تاریخ نگاری کو آسودہ کرنا ہی رہا ہو، لیکن دوران بغاوت، اپنی خدمات کو اجاگر کرنے کی خواہش بھی شاید ان کے تحت الشعور میں پوشیدہ رہی ہوگی۔ کتاب کے دیباچے میں سرسید نے دعویٰ کیا ہے کہ اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ''نہایت صحیح اور سچ ہے'' لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرسید بغاوت کے اسباب کو پوری طرح اجاگر نہ کر سکے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ ہنگامہ وفساد جو پیش آیا، صرف ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال تھا... اگر تم پچھلی عمل داریوں کے ظلم اور زیادتی سے واقف ہوتے تو سرکار انگلشیہ کی عملداری کی قدر جانتے اور خدا کا شکر ادا کرتے، مگر تم نے کبھی خدا کا شکر ادا نہیں کیا اور ہمیشہ ناشکری کرتے رہے۔ اس لیے خدا نے اس ناشکری کا وبال تم ہندوستانیوں پر ڈالا ہے۔''(9)

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں ملنے والی ملکیت اور ایک لاکھ روپئے کو سرسید نے ٹھکرا دیا تھا، اور قوم کی تباہی و بربادی کو دیکھ کر ہندوستان میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا:

''نہایت نامردی اور بے مروتی ہے کہ میں اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں، نہیں! اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے، اور جو مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں کمر ہمت باندھنی چاہیے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔''(10) یہ احساس تھا کہ ہندوستانیوں میں جذبات واحساسات کے باوجود وہ عمل کی حلاوت یا گرمی نہیں جو یورپ کی زندگی کا خاصہ ہے۔ انھوں نے ضروری سمجھا کہ قدیم تہذیبی نظام کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور اسے مغرب کے مادی وعقلی تصورات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ بنیادی طور پر حکومت سے عدم تعاون کی پالیسی، تقلید پرستی، مذموم رسم ورواج کی پابندی، قومی تعصبات کی جکڑ بندی اور جدید تعلیم وتربیت کی کمی مسلمانوں کو تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہی تھی۔

''المامون'' (شبلی) کی اشاعت ثانی کے وقت ان کا خیال تھا کہ تاریخ کو ''احیائے قومی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے'' مگر انھوں نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ''بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں پھل دیتا ہے۔ تاریخ کے بُرے پھل سے مراد ہے کہ لوگ اسلاف کی عظمت پر قانع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے، اس لیے ماضی میں یوں محصور رہنا برا پھل ہے'' ان کا یہ خیال ان کی روایت شکنی پر دلالت کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں سرسید کے خیالات میں بعد میں مزید توسیع بھی ہوئی اور تبدیلی بھی آئی۔ وہ علمی ضرورتوں اور جدید اجتماعی مسائل کو پیش از پیش اہمیت دینے لگے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا کہ ''ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی ''الفاروق'' نہ لکھیں'' اس سلسلے میں ان کے اور نواب عماد الملک کے درمیان طویل خط وکتابت بھی ہوئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے

نزدیک تاریخ کے بعض برے پھل ایسے بھی ہیں جو تعمیر جدید کے حق میں زہریلے ثابت ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کی اپنی حدود اور مطالبے ہیں، روایات کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن بہ قول سید عبداللہ وہ اس معاملے میں اتنے انتہا پسند ہوگئے تھے کہ روایات کے تسلسل سے قومی زندگی کی جو تعمیر ممکن ہے اس سے بھی بے نیاز ہوگئے تھے۔[11] یہ بے نیازی ان کے گہرے غور وفکر کا نتیجہ تھی، جدید علوم وفنون کی طرف مخلصانہ قدم بڑھانے اور حکومت وقت سے تعاون کا فیصلہ بزدلی یا ابن الوقتی کا ثبوت نہ تھا۔[12] بلکہ اس میں وقت کی نزاکت کا احساس کارفرما تھا۔ امداد صابری نے اپنی کتاب ''1857 کے مجاہد شعرا'' میں یہاں تک لکھا ہے کہ ''سرسید کو انگریز کی ہر ہر ادا پسند تھی'' یہ ایک مفروضہ ہے۔ اگر انھیں انگریزوں کی ہر ادا پسند ہوتی تو شاید ان کے قلم سے خطبات احمدیہ جیسی تصنیف وجود میں نہ آتی۔ محسن الملک[13] کے نام ایک خط میں انگریزوں کی لکھی ہوئی ہندوستان کی غلط اور تعصب سے بھری تاریخ کی مذمت میں ان کا قلم نہ اٹھتا، انھیں مغربی تہذیب کی اندھادھند تقلید مقصود ہوتی تو وہ اپنے مضمون میں ترکوں کے تہذیبی محاسن کا مغربی تہذیب سے مقابلہ کرکے ان کی خوبیوں اور مغربی تہذیب کی بعض برائیوں کی نشاندہی نہ کرتے۔[14] سرسید کی ساری ذہنی تربیت مشرقی علوم کے ذریعے ہوئی تھی، وہ ان کے تحفظ کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے لیکن بہ قول پروفیسر خلیق احمد نظامی ''وہ اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ Experimental Age نے علوم و فنون سے استفادے کے پیمانے بدل دیے ہیں۔ جہاں مسائل طبعی تجربے سے ثابت کیے جاتے ہیں''[15] ''تہذیب الاخلاق'' کے اجرا کا مقصد بھی سوئے ہوئے ذہنوں کو بیدار کرنا، ان کو رفتار زمانہ کے ساتھ چلنے کی ترغیب دینا اور ترقی کے اسباب کو دریافت کرنا ہی تھا۔ اس کا بین ثبوت ''تہذیب الاخلاق'' کے پہلے شمارے کی یہ تحریر ہے:

''اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سوشلائیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سوشلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز ومہذب قوم کہلائیں۔''

بہرحال اردو تاریخ نگاری کی روایت میں سرسید کی حیثیت بنیادگزار کی ہے۔ اس عہد کے دو بڑے مؤرخ یعنی شبلی اور ذکاء اللہ نے سرسید سے متاثر ہوکر ہی تاریخی کتابیں لکھیں۔ سرسید نے پہلی مرتبہ پرانی تاریخ کو ازسرنو مرتب کرنے اور تاریخ کی جدید اصولوں پر تدوین اور مطالعے کی اہمیت پر توجہ دی۔ انھوں نے تاریخ کو اجتماعیات کی روشنی میں سمجھنے اور پیش کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے شبلی کے اس طریقہ کار کی تحسین کی کہ واقعات تاریخ کے اسباب دریافت کیے جائیں گویا فلسفۂ تاریخ کی طرف مؤرخوں کی توجہ مبذول کرائی۔ شبلی کی ''المامون''، ''الفاروق''، ''النعمان''، ''الغزالی'' وغیرہ سرسید کے پیدا کیے ہوئے جذبہ ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ ذکاء اللہ کی تاریخ ہند کی ترتیب میں سرسید کی رہنمائی سے صرف نظر ممکن نہیں۔ سرسید اور شبلی کے تعمیری مقاصد میں یکسانیت کے باوجود دونوں کے تاریخی تصور اور دائرۂ کار میں نمایاں فرق ہے۔ یہ فرق دراصل دونوں کے Attitude کا ہے۔ سرسید اور شبلی دونوں تاریخ میں واقعات کے اسباب پر توجہ دیتے ہیں لیکن سرسید سوشل اور کلچرل تفصیلات، سیاسی زندگی کے علاوہ علمی اور ذہنی ترقیوں کے حال پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ شبلی کی نظر بہ قول سید عبداللہ تاریخ کے چند نمایاں ٹکڑوں اور حصوں پر پڑتی ہے یعنی ساری تصویر کی بہ جائے چند نقطے..... تاریخ کے صرف انھی چند لفظوں کو ابھار دینا ان کا واحد نصب العین ہے۔[17] شبلی کے ہیرو بھی برگزیدہ اور عظیم مذہبی شخصیتیں ہیں جہاں عقلیت کی بہ جائے عقیدت اور احساساتی عنصر غالب ہے جب کہ سرسید تاریخ کو آئندہ نسلوں کے لیے اپنے ملک اور قوم کے عروج اور زوال کے صحیح علم کا ذریعہ تصور کرتے ہیں ان کے یہاں بھی بزرگوں سے عقیدت ہے لیکن یہ عقیدت ان کی علمی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی خدمات کے سبب ہے۔ سرسید کے فکروعمل اور تاریخی تصور کو انیسویں صدی کی سماجی اور سیاسی صورتحال، اسلامی اور مغربی فکر کی تاریخ نیز تشکیک اور بے یقینی کی سرحد پر کھڑے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی کیفیت اور اس بے یقینی کے ماحول سے نجات دلانے کی ان کی کوشش کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

مصادر

1. مجموعہ لکچر، ص-183
2. ایضاً، ص 1-200
3. ایضاً، ص-14
4. خلیق احمد نظامی، سرسید احمد خاں
5. علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو، علی گڑھ میگزین، ص-28
6. تکواڑ، اردو ادب دسمبر 2007، ص-26
7. بحوالہ سرسید احمد خاں، خلیق احمد نظامی، ص-1
8. بحوالہ علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر، ص-28
9. تاریخ سرکشی بجنور، ص75-76
10. مجموعہ لکچر، ص-413
11. سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ
12. فرقان احمد، تاریخ ادبیات پاک و ہند، ص-11
13. سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، ص-44
14. ترکوں کی تہذیب، اخبار سائنٹفک سوسائٹی-1976
15. سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، ص-24
16. ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ: عتیق اللہ
17. سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ

□□□

پتہ:
Department of Urdu, Banaras Hindu University,
Varanasi (U.P.)

محمد نعمان خاں

منٹو کی مضمون نگاری

سعادت حسن منٹو بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ ڈرامے، خاکے، فیچر، مکالمے، کالم، اداریے اور مضامین بھی لکھے اور ترجمے بھی کیے۔ شہرت، مقبولیت اور عظمت انھیں افسانہ نگاری کے سبب حاصل ہوئی۔ کبھی ہیرو بنائے گئے اور کبھی ولن سمجھے گئے۔ افراط وتفریط کا یہ عمل منٹو کے افسانوں تک محدود رہا۔ ان کی بقیہ تحریریں اس سے مستثنیٰ رہیں۔ اگرچہ ان کے افسانوں اور مضامین کے موضوعات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ سیاسی سماجی مسائل، نفسیاتی موشگافیاں، سماجی اور مذہبی اجارہ داروں پر مصلحانہ طنز، عورتوں کی آزادی کی حمایت، فسادات، تقسیم کا المیہ، انسان دوستی ان کے افسانوں کی طرح مضامین میں بھی نمایاں ہے۔ منٹو کے افسانوں کا سب سے نمایاں وصف جو انھیں معاصرین میں ممتاز کرتا ہے ان کی جرأت آمیز بے باکانہ حق گوئی اور مزے دار فقرے بازی ہے جس کی رنگ آمیزی ان کے مضامین میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

بلاشبہ منٹو زود نویس فنکار تھے۔ وہ جس موضوع سے متاثر ہوتے تھے اس پر قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اپنی تحریروں پر نظرثانی کا نہ تو انھیں موقع ملا اور نہ ہی ان کی تحریریں نظرثانی کی محتاج نظر آتی ہیں۔

منٹو نے مختلف موضوعات پر سو سے زیادہ مضامین اور کالم تحریر کیے۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''منٹو کے مضامین'' کے نام سے شائع ہوا جس میں 1942 سے قبل لکھے گئے 21 مضامین شامل ہیں۔ بعض مضامین، منٹو کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ''مصور'' میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

منٹو کی تحریروں کا سب سے اہم وصف ان کا دلکش اسلوب ہے، جو معمولی بات کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ کتاب کے پہلے مضمون ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ'' میں چھیڑ خانی کی تاریخ، کیفیت، نفسیاتی عوامل، محرکات اور انسانی جبلّت سے متعلق جو دلچسپ نکات بیان کیے گئے ہیں، ان کا لطف پڑھ کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس نرالے موضوع کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں:

''گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی، سو جب تک مردوں کو وصل نصیب نہیں ہوتا وہ حسرت ہی سے اپنا دل بہلاتے رہیں گے اور خوباں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا، وہ مرد کون تھا جس نے پہلی بار کسی عورت کو چھیڑا، اس کے متعلق تاریخ سے ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت ممکن ہے باغ عدن کی کسی گھنی چھاؤں کے عقب میں یا کسی سایہ دار درخت کے نیچے حضرت آدم ہی نے یہ سلسلہ شروع کیا ہو، کیونکہ وہ جنت سے یوں ہی تو نکالے نہیں گئے تھے۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ حضرت آدم ہی نے اس دلچسپ سلسلے کا آغاز کیا تھا تو پہلی چھیڑ کا تصور ممکن نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ چھیڑ بے حد خام ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس چھیڑ میں انتہا درجے کی لطافت اور نزاکت ہو۔ دراصل اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔'' (ص 1)

جب منٹو نے انشائیہ نما مضمون'' کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی'' میں چھیڑ خانی سے متعلق بارہ خواتین سے انٹرویو لے کر ان کی رائے جاننا چاہی تو ان میں سے نو خواتین نے تقریباً یکساں جواب، اس طرح دیا:

''ہم اس چھیڑ خانی کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتے بلکہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ہماری آزادی میں بے شمار رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب بنی ہوئی ہے۔ غضب خدا کا ہم ڈر کے مارے باہر سیر کو بھی تو نہیں جاسکتے۔ باغ میں گھومنے کے لیے جائیے تو ہمیشہ اس بات کا کھٹکا رہتا ہے کہ کوئی مردوا ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کردے گا اور ایسی بھوکی نظروں سے دیکھے گا کہ سیر کا سارا لطف، سارا مزا کرکرا ہوجائے گا۔ کسی پھول کی طرف دیکھیے تو جھاڑی کے عقب سے کن سُری آواز آئے گی:

انھیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا
چلے ہیں سیرِ گُل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

سیرِ گُل گئی بھاڑ میں اور زخمی گئے چولھے میں۔ کہاں کی سیرِ گُل، کہاں کی شوخی۔ یہ مُگوڑے کچھ کرنے بھی دیں۔ یہ موئی چھیڑ چھاڑ ہے یا گندی موری کے چھینٹے۔ کوئی پکچر دیکھنے جاؤ تو سب گردنیں ہماری طرف مُڑ جائیں گی۔ .... کوٹھے پر بال سکھانے کے لیے جاؤ تو کوئی ہمسایہ اپنے چڑھے ہوئے پتنگ کی ڈور ڈھیلی کرکے بالوں میں الجھا دے گا۔ غصے میں آکر ڈور پکڑ لو تو آواز آئے گی:

'' لے لیجیے جتنی درکار ہے۔'' جھٹکا کر ڈور کھینچنا شروع کی تو انھوں نے چرخی ہاتھ میں لے لی۔ کھینچتے جائیے جب تک آپ تھک نہ جائیں۔ کیا کریں کیا نہ کریں ہم تو عاجز آگئے ہیں۔'' (ص 34)

منٹو کی تحریروں کی جان ان کی بامحاورہ زبان ہے۔ وہ موضوع، موقع محل اور کردار کی مناسبت سے زبان استعمال کرتے ہیں۔ تمہید اور جزئیات نگاری پر

بھی انھیں پورا عبور حاصل ہے۔ جس کی مدد سے وہ قاری کو اپنے دائرۂ اثر میں باندھے رکھتے ہیں۔ ان کے فقرے شعر سے زیادہ لطف دیتے ہیں۔ مضمون ''دیہاتی بولیاں'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آیئے! آپ کو پنجاب کے دیہاتوں کی سیر کرائیں۔ یہ ہندوستان کے وہ دیہات ہیں جہاں رومان، تہذیب وتمدن کے بوجھ سے بالکل آزاد ہے۔ جہاں جذبات بچوں کی مانند کھیلتے ہیں۔ یہاں کا عشق ایسا سونا ہے جس میں مٹی ملی ہوئی ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک ان دیہاتوں میں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ قدم قدم پر آپ کو شاعری نظر آئے گی جو اوزان کی قید اور لفظی بندشوں سے بالکل آزاد ہے۔ یہاں کی کھلی ہوا میں آپ چلیں گے، پھریں گے تو آپ اپنے اندر ایک نئی زندگی پائیں گے۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ بھی عشق کر سکتے ہیں...... آپ بھی پرندوں کی زبان سمجھ سکتے ہیں اور ہواؤں کی گنگناہٹ آپ کے لیے بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ جب گاؤں واپس آنے والے ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھرو بجتے ہیں اور فضا پر ایک دلفریب ناچ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو آپ کا دل بھی پھیلے گا، کبھی سکڑے گا۔'' (ص 52-51)

یہ مضمون دو حصوں میں ہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں پنجاب کے لوک گیتوں سے منٹو کی گہری وابستگی کا علم ہوتا ہے وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان تمام باتوں کا اطلاق منٹو کی تحریروں پر بھی ہوتا ہے۔ منٹو کی تخلیقات میں فطری بے ساختگی، جرأت مندی، حقیقت نگاری، اثر انگیزی شاید اسی کھلے ڈلے ماحول کی دین ہے۔ منٹو جسے بعض حضرات فحش نگار یا دہشت پسند قلم کار تصور کرتے ہیں انھیں یہ نہیں معلوم کہ منٹو کی شخصیت کا یہ لیکھا ڈنا رخ دراصل منٹو کی علاقائی تہذیب کے ارضی مظاہر سے جذباتی وابستگی کا ہی نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں منٹو نے اس ماحول کو زندہ کر دیا ہے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور فطرت نگاری کے گُر سیکھے تھے۔

مضمون ''تحدید اسلحہ'' میں بین الاقوامی سیاست کی فریب کاریوں اور دہشت گردی کی ستم ظریفیوں پر کاری طنز کیا گیا ہے۔ عالم کاری اور صارفیت کے ماحول میں آج کا انسان جس طرح مبتلائے آزار ہے، اس کی ترجمانی نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ قبل منٹو نے جس اثر انگیزی کے ساتھ کی ہے اس سے منٹو کی پیش بینی اور دوراندیشی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ہندی اور اردو زبانوں کو ایک دوسرے کا حریف ثابت کرنے کی کوششیں ابتدا ہی سے جاری ہیں۔ منٹو اس جھگڑے کے علل واسباب کو سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مضمون ''ہندی اور اردو'' کے آغاز سے قبل تحریر کردہ خصوصی نوٹ میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندی اور اردو کا جھگڑا ایک زمانے سے جاری ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر تاراچند جی اور مہاتما گاندھی اس جھگڑے کو سمجھتے ہیں لیکن میری سمجھ سے یہ ابھی تک بالاتر ہے۔ کوشش کے باوجود اس کا مطلب میرے ذہن میں نہیں آیا۔ ہندی کے حق میں ہندو کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟ مسلمان اردو کے تحفظ کے لیے کیوں بے قرار ہیں؟ زبان بنائی نہیں جاتی، خود بنتی ہے اور نہ انسانی کوششیں کسی زبان کو فنا کر سکتی ہیں۔ میں نے اس تازہ اور گرماگرم موضوع پر کچھ لکھنا چاہا تو ذیل کا مکالمہ تیار ہوگیا۔''

منٹو نے اس مضمون میں ہندی اور اردو سے متعلق مسئلے پر منشی نرائن پرشاد اور مرزا محمد اقبال کے مابین مکالمے کے ذریعے فریقین کی اس ہٹ دھرمی کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جس کے سبب یہ مسئلہ ہنوز لاینحل بنا ہوا ہے۔ اس مکالمے میں منٹو کی دانشورانہ فکر قاری کو ان کا ہمنوا بنانے میں اور حقیقت حال سے واقف کرانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

مضمون ''اگر'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو نے اسے غالب کے شعر:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

سے متاثر ہو کر قلمبند کیا ہے۔ بظاہر ایک چھوٹے سے لفظ ''اگر'' کو عنوان بنا کر منٹو نے دنیا کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ تاریخ کا وہ کون سا اہم واقعہ ہے جس کا ذکر اس مضمون میں شامل نہیں ہے؟ تاریخ جیسے وسیع تر موضوع میں ''اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ اور یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا'' جیسے اندیشہ ہائے دور، دراز کے ذریعے منٹو نے اپنی اختراع پسند طبیعت، غیر معمولی تاریخی معلومات اور قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے لیکن غالب کی طرح منٹو بھی آخر میں یہ سوال قاری پر ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ:

''اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا؟ اور اگر خدا نہ ہوتا تو......؟''

یہ ادھورا سوال، جس میں بے شمار جواب پوشیدہ ہیں، نہ صرف حسب توفیق واستعداد، غور وفکر پر آمادہ کرتا ہے بلکہ منٹو کی فنی بصیرت اور خلاقانہ صلاحیت کا بھی غماز ہے۔

شوخی، شرارت، طنز، سادگی، بے باکی اور صاف گوئی منٹو کے ہتھیار تھے جن سے وہ اپنی تحریروں کو بامعنی اور پُر اثر بناتے تھے۔ ان کا مضمون ''ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ نمونتاً دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''ہم ایک عرصے سے یہ شور سن رہے ہیں۔ ہندوستان کو اس چیز سے بچاؤ، اس چیز سے بچاؤ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو ان لوگوں سے بچانا چاہیے جو اس قسم کا شور پیدا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ شور پیدا کرنے کے فن میں

ماہر ہیں، اس میں کوئی شک نہیں مگر ان کے دل اخلاص سے بالکل خالی ہیں۔ رات کو کسی جلسے میں گرما گرم تقریر کرنے کے بعد جب یہ لوگ اپنے پُر تکلف بستروں میں سوتے ہیں تو ان کے دماغ بالکل خالی ہوتے ہیں۔ ان کی راتوں کا خفیف ترین حصہ بھی اس خیال میں نہیں گزرا کہ ہندوستان کس مرض میں مبتلا ہے۔ دراصل وہ اپنے مرض کے علاج معالجے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ انھیں اپنے وطن کے مرض کے بارے میں غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔''

''......ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں جو نئے سے نیا راگ الاپتے رہیں۔ ہمارے ملک کو صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے۔ جو حضرت عمرؓ کا سا اخلاص رکھتا ہو، جس کے سینے میں اَتاتُرک کا سا سپاہیانہ جذبہ ہو، جو برہنہ پا اور گُرسنہ شکم آگے بڑھے اور وطن کے بے لگام گھوڑے کے منہ میں باگیں ڈال کر اسے آزادی کے میدان کی طرف مردانہ وار لیے جائے۔''

آج کے سیاسی تناظر میں جبکہ ہر سال ایک نئی سیاسی پارٹی وجود میں آجاتی ہے، ملک کی خوش حالی اور ترقی کے لیے منٹو کی یہ باتیں کس قدر کھری اور مفید ثابت ہوسکتی ہیں، اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

منٹو، مُحبِ وطن ادیب تھے۔ انھوں نے پہلا افسانہ جلیاں والا باغ واقعے سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ ملک کی ترقی اور خوش حالی میں وہ سبھی طبقوں کی شمولیت کو لازمی تصور کرتے تھے۔ سماجی نابرابری اور فسادات کو انسانی ماتھے کا کلنک سمجھتے تھے۔ ان کا مضمون ''ایک اشک آلود اپیل'' ان کی وطن پرستی اور انسان دوستی کا مظہر ہے، جس میں انھوں نے ممبئی میں ہونے والے فرقہ وارانہ فساد سے متعلق اہلِ وطن سے دردمندانہ اپیل کرتے ہوئے انسانیت کُش اور امن دشمن عناصر کو اس طرح بے نقاب کیا ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جو جنگلی لوگوں کی بربریت کو ازسرِنو ہندوستان کی فضا میں تازہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فضا کو غیر محفوظ کرکے اپنے انفرادی مفاد کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ بازاروں میں دیگر اجناس کی طرح انسانی گوشت پوست کی دکانیں بھی ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے ہر عضو کو مفلوج دیکھنا چاہتے ہیں، جو اپنی مادرِ وطن کو آزاد دیکھنے کے خواہش مند نہیں، جن کی رگ رگ میں بدی کا خون موجزن ہے، جن کی زندگی کا ہر سانس ان کی ریاکاری، دغابازی اور انسان دشمنی کے ساتھ وابستہ ہے، جن کے تنفس میں جہنم کی آگ کے جھونکے ہیں، بدی کے تعفن کے بھبکے ہیں۔ تین دمڑی کا پیسہ جن کا خدا ہے اور جو اس معبود کی عبادت میں شب و روز محو رہتے ہیں۔''

''میکسم گورکی'' منٹو کا سب سے طویل مضمون ہے جس میں گورکی کے سوانحی، خاندانی اور ادبی کوائف کے ساتھ انقلابِ روس کے سلسلے میں گورکی کی کاوشوں پر اظہار رائے کرتے ہوئے انقلاب سے متعلق گورکی کے افسانوں کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں جن کے مطالعے سے خود منٹو کی عالمانہ بصیرت اور ترجمہ نگاری کی صلاحیت کا علم ہوتا ہے۔

''باتیں'' اس اعتبار سے اہم مضمون ہے کہ اس میں ممبئی کے اس فساد کا آنکھوں دیکھا حال اور اس سے متعلق چند واقعات دلچسپ انداز میں پیش کیے گئے ہیں جو کہ انگریزوں کے خلاف برپا ہوا تھا۔ منٹو لکھتے ہیں:

''ہندو مسلم فساد کے دنوں میں ہم لوگ جب باہر کسی کام سے نکلتے تھے تو اپنے ساتھ دو ٹوپیاں رکھتے تھے، ایک ہندو کیپ دوسری رومی ٹوپی۔ جب مسلمانوں کے محلے سے گزرتے تھے تو رومی ٹوپی پہن لیتے تھے اور جب ہندوؤں کے محلے میں جاتے تھے تو ہندو کیپ لگا لیتے تھے۔

اس فساد میں ہم لوگوں نے گاندھی کیپ خریدی۔ یہ ہم جیب میں رکھ لیتے تھے۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوتی تھی جھٹ سے پہن لیتے تھے۔ پہلے مذہب سینوں میں ہوتا تھا، آج کل ٹوپیوں میں ہوتا ہے۔ سیاست بھی اب ٹوپیوں میں چلی آئی ہے۔ زندہ باد ٹوپیاں!''

فسادات سے متعلق منٹو کے اہم مضامین میں ''یومِ استقلال'' اور ''محبوس عورتیں'' بھی شامل ہیں۔

بلاشبہ منٹو ایک سچے فنکار تھے۔ سچائی خواہ کسی روپ میں بھی ہو اس کے قلم کا عنوان بن جاتی تھی۔ ان کی سفاک حقیقت بیانی بہتوں کے لیے دل آزاری کا باعث تھی لیکن وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے بلاخوف تردید بیان کردیتے تھے۔

مضمون ''لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں؟'' میں انھوں نے مدہوش بنانے والی اشیا کے استعمال کے علل و اسباب، نفسیاتی پہلوؤں اور مضر اثرات پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''شراب، افیم، چرس، بھنگ اور تمباکو کا عالم گیر استعمال اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں فرحت یا دل بستگی کا سامان مہیا کرتی ہیں، بلکہ ان کا استعمال صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ ضمیر کے مطالبات سے خود کو چھپالیا جائے۔''

(ص 270)

اس ضمن میں منٹو مزید لکھتے ہیں کہ:

''......مختصر الفاظ میں اس حقیقت سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کرسکتے کہ منشیات کا استعمال خواہ وہ تھوڑی مقدار میں اور باقاعدہ ہو، یا زیادہ مقدار میں اور بے قاعدہ، اونچے طبقے میں ہو یا نچلے طبقے میں، صرف ایک ہی ضرورت کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور وہ ضرورت ضمیر کی آواز کو دبانے کی ہے تاکہ راستے میں کوئی حائل نہ ہو۔''

مضمون کے آخر میں منٹو پُر اعتماد لہجے میں اس سے نجات کا اظہار کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

''انسانیت کی تاریخ میں وہ دن قابل یادگار ہوگا جب اس خطرناک برائی سے نجات حاصل کی جائے گی اور وہ دن دور نہیں۔ اس لیے کہ اس برائی کے نتائج سے لوگ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔ مدہوش بنانے والی اشیا کے متعلق لوگوں کا نظریہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور ان اشیا کے خطرناک نقصانات سے لوگ اچھی طرح واقف ہوگئے ہیں۔ اب وہ دن نزدیک ہے جب یہ بیداری لوگوں کا ان مدہوش بنانے والی چیزوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے گی اور ان کی آنکھیں کھول دے گی تاکہ وہ اپنے ضمیر کے مطالبات دیکھ سکیں اور ان پر غور کر سکیں۔''

منٹو کے سینے میں ایک دردمند دل تھا، جو انسانیت کے نام پر دھڑکتا اور مظلوموں کی حمایت میں بے چین رہتا تھا۔ انسانی دکھ درد، سماجی نابرابری، معاشی بدحالی، نفسیاتی الجھنیں انھیں لکھنے پر آمادہ کرتیں اور ان کے اظہار میں وہ پوری بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔ مضمون ''کسان، مزدور، سرمایہ دار، زمیندار'' میں قحط، افلاس اور بھوک کے سنگین مسائل کو موضوع بنا کر اس مسئلے کے حل سے متعلق لکھتے ہیں:

''ہم دو رستوں کے چوک پر کھڑے ہیں اور ہمیں ایک راستہ انتخاب کرنا ہے۔ ایک راستہ انسان کو دائمی برائیوں اور لعنتوں میں مبتلا کرنے کے لیے ہے۔ اس میں بدکرداروں کے آشکارا ہونے کا ڈر اور موجودہ نظام کے بدل جانے کا احتمال قدم قدم پر نظر آتا ہے۔

دوسرا راستہ سچے دل سے حقیقی اصولوں کو مان لینے اور ان کی ترویج کے لیے بے لوث کوشش کرنے کے لیے کھلا ہے۔ وہ اصول جن کی ترویج کے لیے انسانی عقل اور ادراک پکار رہی ہے اور آج یا کل ضرور منوا لیے جانے والے ہیں۔ اگر ہم نہیں تو ہمارے بعد آنے والی نسلیں انھیں منوا کر رہیں گی۔ اس لیے کہ اس انانیت کا استیصال ہی ان تمام بلاؤں اور آفتوں سے ملک اور قوم کو بچا سکتا ہے۔''

مضمون ''ترقی یافتہ قبرستان'' اس فرنگی تہذیب پر زبردست طنز ہے جو کہ تیزی سے ہندوستانی سماج میں سرایت کرتی جارہی ہے۔

سعادت حسن منٹو فلمی صنعت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ گلیمر کی اس جگمگاتی دنیا کے اندھیروں کو انھوں نے نہ صرف قریب سے دیکھا اور محسوس کیا بلکہ وہ اس کی مصنوعی فضا کا شکار بھی ہوئے۔ فلم نگری سے متعلق اپنے کھٹے میٹھے تجربات کو انھوں نے جن مضامین میں فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے، ان میں ''شریف عورتیں اور فلمی دنیا''، ''ہندوستانی صنعتِ فلم سازی پر ایک نظر'' اور ''زندگی— ایک ریویو'' شامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو ایسی فلموں کی حمایت کرتے ہیں جو تفریح بہم پہنچانے کے ساتھ غور وفکر پر بھی آمادہ کریں۔ اسٹار سسٹم انھیں پسند نہیں۔ فلموں میں اشاریت اور اختصار پسندی کو وہ آرٹ کا جوہر سمجھتے تھے۔ منٹو کو شکایت تھی کہ فلم انڈسٹری پر کم ذہن، دولت مند لوگوں کا قبضہ ہے۔ وہ نوجوان جو فلموں کا استعمال آرٹ کے طور پر کرنا چاہتے ہیں، ان کی راہیں مسدود ہیں۔

''زندگی— ایک ریویو'' ہدایت کار بروا کی شہرۂ آفاق فلم پر ایک طویل تبصرہ ہے۔ اس کے مطالعے سے منٹو کی کامیاب تبصرہ نگاری اور تجزیہ نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔

فلم ''زندگی'' پر وہ اپنے مخصوص انداز میں اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

''زندگی اچھا فلم ہے۔ اس لیے کہ اس میں زندگی کے سوا سب کچھ تھا۔ اس میں کھوئی دوئی تھی جو صرف بروا ہی چلا سکتا ہے۔ اس میں گیت تھے جو صرف سہگل ہی گا سکتا ہے۔ اس میں مکالمے تھے جو صرف جمنا ہی ادا کر سکتی ہے...اس میں فلسفہ تھا جو جمیل انصاری صاحب نے سمجھ لیا ہے۔ اس میں موم بتی بجھنے کا ناچ تھا جو فنی نقطۂ نگاہ سے بہت ہی بلند ہے اور جسے خواجہ عباس صاحب نے بھی بہت پسند کیا اور ان سب کے اوپر اس میں تیلی چینچی ہے جو میاں کاردار صاحب کو بہت پسند ہے اور جو فلم میں باکس آفس ویلیو پیدا کرتی ہے۔''

تبصرہ نما اس مضمون سے متعلق وارث علوی کی یہ رائے درست ہے کہ:

''اس تبصرے سے جو چیز سب سے پہلے ہمارا دھیان کھینچتی ہے، وہ اسلوب نگارش ہے۔ جذبے کی آنچ سے دہکا ہوا اسلوب، مضمون کی تنقید اور طنز کو دوآتشہ بناتا ہے۔ ایک معنی میں تو یہ مضمون تنقید کے جدید بے تکلف اسلوب کا پیش رو ہے اور آج بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔''

(سعادت حسن منٹو، از وارث علوی، ساہتیہ اکادمی دہلی، ص۔ 36)

منٹو کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ''تلخ، ترش اور شیریں'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں شامل مضامین میں زیادہ نکھار، تنوع اور رنگارنگی ہے۔ یہ مضامین موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

مضمون ''دیواروں پر لکھنا'' کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے: ''اس دیوار پر لکھنا منع ہے۔'' منٹو عوام کے نبض شناس تھے وہ اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ عوام کو جس کام سے روکا جائے وہ اسے ضرور انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا ہدایت یا اپیل کا جو حشر ہوتا ہے اس کے متعلق اس مضمون میں دلچسپ صورتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ منٹو کا یہ جملہ عوامی نفسیات کا ترجمان ہے:

''ایسی مصوری اور شاعری کو دیکھ کر انسان نقش بہ دیوار ہو جاتا ہے۔''

''ناک کی قسمیں''، ''اور کچھ ناموں کے بارے میں'' بھی ایسے ہی پرلطف اور دلچسپ مضامین ہیں۔

مرزا غالب سے منٹو کو فطری مناسبت تھی۔ غالب ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ منٹو نے اپنے بعض مضامین کے عنوان غالب کے مصرعوں پر قائم کیے اور ان کے بعض مضامین غالب کے اشعار کے ترجمان ہیں۔ منٹو نے غالب سے متعلق دو مضامین "مرزا نوشہ اور چودھویں" اور "آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی" قلم بند کیے ہیں۔ اوّل الذکر مضمون میں منٹو نے ہی سب سے پہلے غالب، ڈومنی اور کوتوال کے مثلث پر ایک ایسی کہانی بُنی کہ وہی کہانی فلم مرزا غالب کی بنیاد قرار پائی۔ کہانی نما اس مضمون کی مقبولیت اور دلچسپی پر مزید کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہوگا۔

آخر الذکر مضمون میں راجہ بلوان سنگھ کے ساتھ پتنگ بازی کے سلسلے میں غالب کے دلچسپ واقعات اور پتنگ بازی کی اصطلاحات کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اور منٹو دونوں ماہر پتنگ باز تھے۔

"کرچیں اور کرچیاں"، "پردے کی باتیں"، "اپنی اپنی ڈفلی"، "اور دیکھ کبیرا رویا" ہلکے پھلکے مضامین ہیں جو محض لطف و انبساط پیدا کرنے کی خاطر معرضِ وجود میں لائے گئے ہیں۔ ان میں سیاسی سماجی طنز ضرور ہے لیکن وہ گہرائی، بصیرت اور نکتہ آفرینی نہیں ہے جو کہ منٹو کے دیگر مضامین میں نظر آتی ہے۔ تقریباً یہی بات "اوپر، نیچے اور درمیاں" کے مضامین اور خطوط کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہ صحافتی انداز کی تحریریں ہیں جن میں نہ طنز کی نشتریت ہے نہ مزاح کی چاشنی!

سعادت حسن منٹو نے ایسے کئی فکر انگیز مضامین بھی تحریر کیے ہیں جن میں دورِ جدید کے ادبی تقاضوں اور مسائل پر کھل کر بحث کی گئی ہے "سفید جھوٹ"، "کسوٹی"، "افسانہ نگار اور جنسی مسائل" اور "ادب جدید" کے مطالعے سے منٹو کی دانشورانہ طرزِ فکر اور بے باکانہ اندازِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔

منٹو کے مضامین تخلیقی جوہر سے آراستہ ہیں۔ ان میں تنقیدی موشگافیاں اور مدرسانہ نصیحتیں شامل نہیں۔ یہ مضامین ایسے سلجھے ہوئے ادبی شعور کے حامل فنکار کی سعیِ پیہم کا نتیجہ ہیں جو موضوع کی اہمیت پر گہری نظر رکھتا ہے اور صدقِ دل سے مسائل کا حل بھی چاہتا ہے۔

منٹو کی شہرت اور مقبولیت کا سبب ان کی افسانہ نگاری ہے لیکن مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان کے مضامین بھی کم اہم نہیں ہیں۔ یہ مضامین آج بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور ان کی معنویت آج بھی اسی طرح برقرار ہے جیسی کہ ان کے عہد میں تھی۔ منٹو کو سمجھنے، پرکھنے اور ان کی شخصیت اور فن پر رائے قائم کرنے میں یہ مضامین ہماری بھرپور مدد کرتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Languages,
NCERT,
Sri Aurobindo Marg,
New Delhi-110016

واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات

مصنف: کوکب قدر سجاد علی میرزا

نواب واجد علی شاہ کی شخصیت کا اصل معیار طے کرنے کے لیے سنی سنائی باتوں کے بجائے تاریخی شواہد کا مطالعہ ناگزیر ہے۔
مصنف نے اس کتاب میں واجد علی شاہ کی ذاتی، سیاسی، تعلیمی و ثقافتی زندگی کو تاریخ اور حقائق کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں ان کی ولادت، خاندان، تعلیم، ازدواجی زندگی، اولاد، ولی عہدی، شاہی معزولی، نظر بندی، جلاوطنی سے وفات تک کی روزمرّہ کی سرگرمیوں اور ان کی شعری و نثری تمام تصانیف کا تحقیقی مطالعہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مصنف کوکب قدر سجاد علی میرزا کا تعلق نواب واجد علی شاہ کے خانوادے سے ہے۔

صفحات: 688، قیمت -/97 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

حبیب الرحمٰن چغتائی

نشاطِ آبلہ پائی

اردو میں ادھر سفرناموں اور آپ بیتیوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ دراصل دونوں کا تعلق بیانیہ صنف ادب سے ہے۔ دونوں میں مصنف کا کردار مرکزی ہوتا ہے اس لیے ان میں بڑی مماثلت ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے سفرنامہ، آپ بیتی اور آپ بیتی، سفرنامہ ہوتی ہے۔ محمد جعفر تھانیسری کی '' تواریخ عجیب موسوم بہ کالا پانی'' کو سفرنامہ بھی کہا جاتا ہے اور آپ بیتی بھی۔ نجی زندگی کی سرگزشت '' آپ بیتی'' ہوتی ہے اور سفر کی روداد '' سفرنامہ'' کہلاتی ہے۔ جب انسان نئے مقامات دیکھتا ہے اور نئے لوگوں سے ملتا ہے تو تحیر کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ لہٰذا سفرنامے میں حیرت واستعجاب صاف ظاہر ہوتا ہے۔ سفرنامے کے لیے سفر شرط اولیں ہے۔ سفر انسانی جبلت ہے۔ اس کی بنا تو اسی دن سے پڑ گئی تھی جب حضرت آدم کو ایک گناہ کی پاداش میں عالم بالا سے روئے زمین پر آنا پڑا تھا اور یہ سفر حیات اخروی تک جاری رہے گا۔ سفر کرتے تو سبھی ہیں مگر ہر مسافر سیاح ہوتا ہے نہ ہر سفر ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل میں تنوع اور سہولتیں پیدا ہوئیں اور وسائل میں بھی اضافہ، مزید برآں عالمی سطح پر سیر و سیاحت کو فروغ دیا جانے لگا تو انجام کار شوق سفر بھی بہت بڑھ گیا۔

اطہر صدیقی بنیادی طور پر ایک سائنس داں ہیں اسی لیے وہ ہر چیز کا مشاہدہ بڑی گہری نظر سے کرتے ہیں۔ سیاحت ان کا مشغلہ ہے۔ جن مقامات سے بھی وہ گزرتے ہیں ان کا مشاہدہ بسط وتفصیل سے کرتے ہیں اور کاغذ پر اس طرح مرتسم کرتے ہیں کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے گویا وہ خود اپنی آنکھ سے انھیں دیکھ رہا ہے۔ ان کی منظرکشی اور جزئیات نگاری قاری کو اپنا ہم سفر بنا لیتی ہیں۔ اطہر صدیقی کا تخلیقی سفر سفرناموں سے شروع ہوا۔ جب ذرا حوصلہ افزائی ہوئی تو اپنی زندگی کے سفر کو سپرد قلم کر ڈالا۔ ان کی آپ بیتی '' میں کیا میری حیات کیا'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں آٹھ سفرنامے شامل ہیں۔ ان کے ابتدائی اسفار کا سبب ممکن ہے حصول علم و زر ہو مگر شوق جستجو انھیں ہمیشہ آمادۂ سفر کرتا رہا۔ ان کی پیرانہ سالی ان کے شوق سفر کو زنجیر کر سکی نہ ان کے عزائم کو پست۔ ان کا یہ جواں عزم و حوصلہ دیکھیے انھیں کہاں کہاں لے جاتا ہے: '' رکے نہ آبلہ پایان راہ شوق کہیں، کہ فاصلوں کی طرح حوصلہ بھی کم نہ ہوا۔

چھ اسفار پر مشتمل اطہر صدیقی کے سفرناموں کا تازہ مجموعہ '' نشاط آبلہ پائی'' ہے۔ ان میں مشرق ومغرب کے چند شہروں کی روداد سفر کے علاوہ دونوں تہذیبوں کے تصادم اور افکار واقدار میں تضاد کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ امریکا اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود بزرگوں کو ذہنی سکون فراہم کرتا ہے نہ جذباتی استحکام، علی گڑھ جیسا چھوٹا سا شہر انھیں جائے امن وامان نظر آتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سفرنامہ محض گنجینۂ معلومات نہیں ہوتا، اس مقصد کے لیے تو بنیادی ماخذ اور رہنما کتابوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے، سفرنامے کا تعلق ادب سے جوڑنے کے لیے مصنف کے تاثرات، جذبات، مشاہدات، تجربات، اور واردات کی آمیزش ضروری ہے۔ اگر صرف اعداد وشمار اور جملہ معلومات فراہم کردی جائیں تو ایک بے کیف دستاویز تو تیار ہوسکتی ہے سفرنامہ نہیں۔ مشفق خواجہ فرماتے ہیں '' روایتی سفرنامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتا ہے اور غیر روایتی سفرنامہ کیفیت سفر سے۔ مقامات سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان ومکاں کا اسیر ہوتا ہے جبکہ کیفیات سفر قلمبند کرنے والا زمان ومکاں سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہی چیز اس کے سفرنامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے۔'' (دیباچہ '' موسموں کا عکس'' جمیل زبیری) اس اقتباس کی روشنی میں اطہر صدیقی کے سفرناموں میں روایت وغیر روایت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں: '' اچھا سفرنامہ وہ ہے جس میں داستان کی سی داستان طرازی، ناول کی سی فسانہ سازی، ڈرامے کی سی منظرکشی، کچھ آپ بیتی کا مزہ، کچھ جگ بیتی کا سا لطف اور پھر سفر کرنے والا جز وتماشہ ہوکر اپنے تاثرات کو اس طرح پیش کرے کہ اس کی بات پر لطف ہو اور معلومات افزا بھی'' (سخن چند '' دیکھ لیا ایران'' افضل علوی)۔ اطہر صدیقی کے سفرناموں میں جملہ صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ممتاز مفتی نے اپنے سفرنامۂ حج '' لبیک'' کو رپورتاژ کا نام دیا ہے۔ بیانیہ صنف میں وسعت ہی اتنی ہے کہ اس میں بہت کچھ سما سکتا ہے۔ رپورتاژ تو بہرحال اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

سفرنامہ مصنف کی شخصیت اور ذہنی رویے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک ہی مقام کے سفر کی روداد جب دو اشخاص لکھتے ہیں تو اس میں یکسانیت

نہیں ہوتی۔ یہ اختلاف اندازِ فکر اور زاویۂ نگاہ کا غماز ہوتا ہے جو مصنف کا امتیازی وصف قرار پاتا ہے۔ ہاں اگر بنیادی معلومات میں نمایاں فرق ہو تو کھل نظر ہوسکتا ہے۔ ابن انشا نے اپنے چین کے سفرنامے "چلتے ہو تو چین کو چلیے" میں دیوارِ چین کا بیان یوں کیا ہے: "چین والے اپنی زبان میں اس کو دس ہزار میل لمبی دیوار کہتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ ڈیڑھ ہزار میل کے لگ بھگ ہے۔ کہیں یہ پندرہ فٹ اونچی ہے کہیں پچاس فٹ۔ کچھ حصہ بڑی بڑی اینٹوں سے بنا ہے کچھ پتھروں سے۔ دیوار کے زیادہ تر حصے کے ساتھ ایک بیرونی خندق بھی کھدی دکھائی دے گی۔ یہ ڈیڑھ ہزار میل کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا ہے۔" اسی دیوارِ چین کے بارے میں اطہر صدیقی اپنے سفرنامے "مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر" میں رقم طراز ہیں: "دو ہزار سال پرانی دیوارِ چین تقریباً پانچ چھ کلومیٹر لمبی ہے اور چین کے مشرقی ساحل سمندر سے شمال مغرب گوبی ریگستان تک بنی ہوئی ہے گو کہ بہت سے مقامات پر دیوار وقت کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔" ان اقتباسات کو نقل کرنے میں کوئی موازنہ مقصود نہیں تاہم جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کی صحت و سند کے بارے میں سوال ضرور اٹھتا ہے۔

تقسیم ملک کے سانحے کا کرب بہت سے لوگوں کے لیے سوہانِ روح بن گیا ہے۔ "کراچی یاترا" میں اطہر صدیقی اسی درد و کرب کے ساتھ اس لاقانونیت اور عدم استحکام کا شکوہ کرتے ہیں جو پاکستان کا مقدر بن گیا ہے۔ پاکستان کی نئی ثقافت میں نمائش اور اسراف کو جو مقام حاصل ہے اس کا بھی ذکر ملتا ہے، بچھڑوں سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے اس کیفیت کا اظہار بھی خوب ہے۔ ہندوستان سے پاکستان جو لوگ بھی جاتے ہیں عموماً سیاحت ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں سیاح کی نگاہ کام کر جائے وہ اور بات ہے ورنہ ہجر و فراق کے درد و الم کو کم کرنے کے لیے ملاقاتیں اور نشستیں ہی اہم ہوتی ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے سفرناموں میں ملاقاتوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سفرنامے میں بھی یہ چیز نمایاں ہے۔

مصنف نے چین کی بھی خوب سیر کرائی ہے، ہزاروں سال پرانی تاریخ و ثقافت سے پردے اٹھائے ہیں۔ بوٹے قد کی خوبصورت اور جفاکش لڑکیاں، ہریالی، درخت، رنگ برنگے پھول، پھل، کھانے پینے کی چیزیں، مہماں نوازی، لباس، صنعت و حرفت، کثیر آبادی، رقص و سرود، مسجدیں، سڑکیں، عمارتیں، زبان کیا کچھ ہے جس کا ذکر تفصیل سے دلکش انداز میں نہیں کیا گیا ہے۔ جنگلش کا تعارف بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ان کی باریک بینی، ژرف نگاہی جزرسی اور معجز بیانی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے: اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

الحمرا دیکھنے کا انھیں بچپن سے ارمان تھا اور جب منزل سامنے آگئی تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اندلس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے فسوں میں وہ کھو گئے۔ وہاں کی ہر شے نے انھیں مبہوت کردیا۔ ہر چیز کو بڑے جذب و شوق سے دیکھا اور ضبط تحریر میں لائے۔ ملاحظہ فرمایئے: "الحمرا کی اصل خوبصورتی اس کے اندر کے محلات میں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ پس منظر میں سیارانوادا (Snowy Mountain) کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں جن پر موسم سرما میں برف جم جاتی ہے اور پورا پہاڑ سفید نظر آتا ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد الحمرا کے باہر سرچ لائٹس جلادی جاتی ہیں جو اپنی روشنی الحمرا کے مختلف باہری حصوں پر منعکس کرکے محل کی فصیلوں کو منور کردیتی ہیں...... اور وہاں (سینٹ نکولس گرجا گھر) سے الحمرا کو برقی روشنی میں نہاتے ہوئے دیکھنا بہت خوبصورت منظر لگتا ہے۔"

کتاب کے آخر میں اپنی پچاس سالہ خوشگوار ازدواجی زندگی کے رموز سربستہ کو شامل کرکے وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں: "یہ بیانِ حال، یہ گفتگو، ہے مرا نچوڑا ہوا لہو، ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھو، نہ سنو گے ایسی کہانیاں۔"

اطہر صدیقی زبان بہت شگفتہ اور شستہ لکھتے ہیں۔ مگر اس پاکیزہ تحریر میں 'تلاشنا'، اور 'قبضانا'، جسے انمل بے جوڑ الفاظ حسِ لطیف پر گراں گزرتے ہیں۔ مزید برآں مصنف کی عدم توجہی کے سبب بعض تسامحات کتاب میں راہ پاگئے ہیں، اگر وہ خصوصی توجہ دیں تو زبان کا حسن دوبالا ہو جائے گا۔ برمحل اشعار کا استعمال ان کے شعری ذوق کا پتا تو دیتا ہی ہے ان کے اندازِ بیاں کو اور بھی موثر بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی تصانیف کے عنوانات کے انتخاب میں بڑا اہتمام کرتے ہیں "نشاطِ آبلہ پائی" اس کا بین ثبوت ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک شعر ہی سے ماخوذ ہے لیکن ان کا حسنِ انتخاب داد کا مستحق ہے۔ سفرناموں کے چند خوبصورت عنوانات مثلاً "دکھلایئے لیجا کے اسے مصر کا بازار" قرۃ العین حیدر، "چلتے ہو تو چین کو چلیے" ابن انشا، "نکلے تری تلاش میں" مستنصر حسین تارڑ، "رہ نوردِ شوق" سید عابد حسین، "زمین اور فلک اور" انتظار حسین، "تک تک دیدم" بشریٰ رحمن وغیرہ کی فہرست میں "نشاطِ آبلہ پائی" یقیناً ایک حسین اضافہ ہے۔

□□□

پتہ:
Hareem, Millat Road,
Doodhpur, Civil Lines,
Aligarh-202002 (U.P.)

درخشاں زریں

کربلائی اور شخصی مرثیے

مرثیے کا جب ہم عمومی ذکر کرتے ہیں تو اس کے دائرے میں کربلائی اور شخصی دونوں طرح کے مرثیوں کا تصور ابھرتا ہے۔ مرثیے کی تعریف میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پہلو پر مزید کچھ کہنا کارِ زیاں معلوم ہوتا ہے لیکن ماہرینِ فن نے جو تعریفیں کی ہیں ان میں سے بیشتر کی آرا کربلائی مرثیے تک محدود ہیں۔ شخصی مرثیے کی تاریخ کربلائی مرثیے سے اگرچہ پرانی ہے لیکن کربلائی مرثیے کا کینوس اور سرمایہ وسیع ہے جبکہ شخصی کا محدود اور مختصر۔ اردو میں کربلائی مرثیے کا پہلا سرا اشرف بیابانی (1) سے اور شخصی مرثیے کا شاہ برہان الدین جانم (2) سے ملتا ہے۔ سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کربلا سے وابستہ افراد بھی تو الگ الگ شخصیات ہی ہیں۔ پھر ان سے متعلق شاعری کو کربلائی اور دیگر شخصیات سے متعلق شاعری کو شخصی مرثیہ کیوں کہتے ہیں۔ اس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ کربلا سے وابستہ شخصیات کے سامنے ذاتی یا اختراعی نصب العین نہیں تھا۔ ان کے سامنے مذہب اور خدائی فرمان تھا جو یہ دعوت دے رہا تھا کہ حق کے لیے سر کٹا دو لیکن باطل کے سامنے سر نہ جھکاؤ۔ اہلِ کربلا نے اس نصب العین کے لیے اپنی جانوں کی قربانیاں دے دیں۔ لہٰذا الگ الگ شخصی وجود کے باوجود انھیں واقعۂ کربلا سے الگ نہیں کر سکتے۔ جب کہ دیگر کا نصب العین مختلف نظریات سے اخذ شدہ ہو سکتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے، مرثیہ کہتے ہیں۔'' (3)

اس طرح مرثیہ ہم اس صنفِ شعر کو کہیں گے جس میں کسی شخص کی موت کے بعد اس کے اوصاف بیان کیے جائیں۔ مرثیے کی تعریف وقت اور ماحول کے پس منظر میں بھی کی جاتی رہی ہے، اس کی مثال وہ جدید مرثیے ہیں جن میں حسینؑ اور کربلا علامت کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہم میں انقلاب اور تحریک کی جوت جگاتے ہیں لیکن اس کا بھی تعلق کربلائی مرثیے سے ہی ہے۔

کربلائی مرثیے سے مراد وہ مرثیہ ہے جس کا تعلق واقعۂ کربلا سے ہو۔ واقعاتِ کربلا کے ہیرو حضرت امام حسینؑ، ان کے اقربا اور اصحاب کے ساتھ اہلِ کوفہ اور یزید کی فوجوں کا ظلم و بربریت اور خانوادۂ رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کی شہادتوں کے پر درد تذکرے جس صنفِ شاعری میں بیان کیے جائیں انھیں ہم کربلائی مرثیے کا نام دیتے ہیں۔ اس واقعے کا ذکر شعرا نے نہ صرف واقعۂ کربلا کے مرکزی سانحے تک محدود رکھا بلکہ اہلِ بیت، صحابۂ کرام اور پاسدارانِ حق وصداقت کی انفرادی حیاتوں اور شہادتوں کے ذکر کو بھی جگہ دی۔ چنانچہ امام حسینؑ کے حق کا اعلان، مدینے سے روانگی، مسلم بن عقیلؓ اور ان کے بچوں کی کوفے میں شہادت، سفرِ شام، قید خانے کی صعوبتیں، حضرت قاسم، حضرت علی اکبر، حضرت علی اصغر، عون ومحمد اور عباس علمدار جیسی شخصیات کے اعمال و کردار، ان کے محسوسات، ذہنی کیفیات اور اہلِ بیت کے اخلاق و کردار اور طرزِ بود و باش کے بیان کے ساتھ اعوان و انصار جیسے حُر، زہیر ابن قیس اور حبیب ابن مظاہر جیسی شخصیات کی سیرت بھی اجاگر کی جاتی ہے۔ دکن سے لے کر شمالی ہند تک کے شعرا نے ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا میں میر خلیق، میر ضمیر، دلگیر، انیس، دبیر، نفیس، عشق، تعشق اور رشید جیسے شعرا نے کربلائی مرثیے کے موضوعات میں وسعت اور اس کے سرمایے میں بیش بہا اضافے کیے۔ اس کے علاوہ کربلائی مرثیے کے جدید دور کا جب آغاز ہوا تو اس دور کے شعرا جیسے جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، آلِ رضا، نسیم امروہوی، نجم آفندی وغیرہ نے واقعۂ کربلا اور حضرت امام حسینؑ کی جنگ اور شہادت کے مقصدی پہلو کو بھی سامنے رکھا اور اپنے مرثیے سے واقعۂ کربلا کے پیغامات کو عام کیا۔ کربلائی مرثیے کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

حسینؑ کی عظمت —

تم کون ہو حسینؑ ہے مختارِ خشک و تر
ان کے سوا ہے کون شہنشاہِ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھوگے اگر ادھر
شیروں کا یاں عمل ہے تمھیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

[میر انیس]

شہادت کا ایک منظر —

لاشوں پہ لائیں بیبیاں زینب کو تھام کر
ماتم کی صف پہ گر پڑیں وہ سوختہ جگر

بولیں بڑھا کے دستِ مبارک ادھر ادھر
بیٹے کہاں ہیں مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر
کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو، نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

[مرزا دبیر]

اخلاقی پہلو۔

ہر چند عمر چھوٹی ہے اور بھوکی پیاسی ہو
پر دل میں یہ تو سوچو کہ کس کی نواسی ہو

[دلگیر]

جدید پیغام۔

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہر یار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دو چار
اے زندگی جلالِ شہہ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے

[جوش ملیح آبادی]

جیسا کہ سطورِ بالا میں کہا گیا کہ ''شخصی مرثیے'' میں ہم کسی سیاسی، سماجی، نسبتی، اہم شخصیات کی وفات پر ان کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہیں اور ان سے اپنی قربت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ آغا مرزا محمود لکھتے ہیں:

''وہ مرثیے جو مختلف مشاہیرِ قوم یا کسی عزیز کی موت پر لکھے جاتے ہیں، انھیں شخصی مرثیہ کہتے ہیں۔''(4)

کربلائی مرثیے کی طرح شخصی مرثیہ لکھنے والے کی بھی اپنے ممدوح سے جتنی قربت رہی ہوگی اسی اعتبار سے مرثیہ پراثر ہوگا ورنہ وہی حال ہوگا جو عربی شاعر متمم بن نویرہ جیسے باکمال شاعر کا حضرت عمر فاروق کی فرمائش پر ان کے بھائی یزید کا مرثیہ لکھنے کے بعد ہوا تھا۔(5)

شخصی مرثیے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ عرب میں دورِ جاہلیت میں بھی شخصی مرثیے کثرت سے کہے جاتے تھے بلکہ عربی کے رثائی ادب کا بڑا سرمایہ شخصی مراثی پر ہی مبنی ہے۔ فارسی شاعری میں رودکی سے ہی شخصی مراثی کا سلسلہ قائم ہے۔ ان کے علاوہ فرخی، انوری اور فردوسی نے شخصی مراثی لکھے۔ فردوسی نے اپنے جوان بیٹے کے انتقال پر اشعار کہے وہ شخصی مراثی کے باب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اردو میں شخصی مراثی کی ابتدا عام طور پر غالب و مومن سے منسوب کی جاتی ہے لیکن ہمارے ادب میں شخصی مرثیے کی ابتدا شاہ برہان الدین جانم (وفات 990ھ) سے ہوتی ہے۔(6) انھوں نے اپنے والد شاہ میراں جی کی وفات پر اپنے درد و غم کا اظہار کیا تھا۔ بعد کے شعرا میں جعفر زٹلی، سودا، میر تقی میر، انشا وغیرہ کے نام آتے ہیں، غالب نے دو مرثیے کہے... ایک مرثیہ اپنے منہ بولے بیٹے مرزا زین العابدین خاں عارف کی موت پر لکھا اور دوسرا اپنی محبوبہ کی موت پر۔ مومن نے اپنی محبوبہ کی موت پر مرثیہ کہا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے پانچ شخصی مرثیے لکھے... مرثیۂ غالب، مرثیۂ حکیم محمود خاں، مرثیۂ ملکہ وکٹوریہ، مرثیۂ محسن الملک اور اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کا مرثیہ۔ داغ کا مرثیہ ''داغ کے پھول'' کے نام سے سرور جہاں آبادی نے لکھا، اکبرالہ آبادی نے اپنے نوعمر بیٹے ہاشم کی موت پر مرثیہ کہا، اقبال نے داغ دہلوی کی وفات پر مرثیہ لکھا۔ چکبست نے ''نشترِ یاس'' کے نام سے اپنے عزیز پنڈت تیج ناتھ نرائن کی وفات پر مرثیہ لکھا، انھوں نے سیاسی رہنما گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک اور اپنے استاد بشن نرائن کی وفات پر بھی مرثیے لکھے۔ جوش ملیح آبادی نے مہاتما گاندھی اور محمد علی جوہر کی وفات پر مرثیے لکھے۔ ایسی مثالوں کی ہمارے رثائی ادب میں ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست سے قطع نظر شخصی مرثیہ گویوں نے اپنی مرثیہ گوئی میں ممدوح کی شخصیت کے روشن پہلو، ان سے اپنی محبت اور انسیت، سماجی اور معاشرتی سطح پر ان کی اہمیت اور ان سے بچھڑنے کا غم بیان کیا ہے۔

کربلائی مرثیے اور شخصی مرثیے میں ایک بنیادی فرق اجزائے ترکیبی کا بھی ہے۔ کربلائی مرثیے کے دورِ عروج یعنی خلیق و ضمیر سے انیس و دبیر اور عشق و تعشق تک مرثیہ نگاروں نے مسدس کی ہیئت کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کے اجزائے ترکیبی بھی متعین کر دیے۔ مثلاً چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین— لیکن شخصی مرثیے میں ان کی گنجائش نہ تھی اس لیے شخصی مرثیے میں یہ اجزا نہیں ملتے۔ شخصی مرثیے کے لیے ہیئت کی تخصیص بھی کبھی نہیں رہی۔(7) اگرچہ مسدس کی ہیئت میں بھی شخصی مراثی لکھے گئے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

عارف کا مرثیہ غزل کی ہیئت میں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

[غالب]

مومن نے اپنی محبوبہ کا مرثیہ ترکیب بند کی ہیئت میں لکھا:

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج

آغوش رشکِ حلقۂ اہلِ عزا ہے آج
برباد شورِ رعد ہوا آپ اشک پر
کیسا وفورِ شیون وجوشِ بکا ہے آج
مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا
ماتم میں مر رہا ہوں میں یہ کون مر گیا

مرثیۂ سرسید احمد خاں جو غزل کی ہیئت میں ہے:

تمھیں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

[محمد علی جوہر]

داغ کا مرثیہ مثنوی کی ہیئت میں:

چل بسا داغ آہ، میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے
اب کہاں وہ بانکپن، وہ شوخیِ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

[اقبال]

مہاتما گاندھی کا مرثیہ مسدس کے فارم میں:

مئے محبتِ انسانیت کا متوالا
کہ جس نے عقل کو سانچے میں عشق کے ڈھالا
بنا کر جس نے اہنسا کو جنگ کا آلہ
ملوکیت کا مزاجِ کہن بدل ڈالا
جھکا دی گردنِ مغرورِ کج کلاہوں کی
جھپک رہی تھی پلک جس سے بادشاہوں کی

[جمیل مظہری]

غرض شخصی مرثیے ہوں یا کربلائی مرثیے، دونوں میں کسی کی موت پر اظہارِ غم کیا جاتا ہے۔ ان میں کربلائی مرثیے کا تعلق واقعۂ کربلا سے ہے جس کا موضوع اور مقصد مذہبی اور آفاقی ہے اور جو اظہارِ غم کے ساتھ حق کا پرچم اٹھانے کا درس دیتا ہے جب کہ شخصی مرثیے میں مرثیہ نگار کسی عزیز، رہنما یا بڑی سماجی شخصیت کی موت پر اپنے تاثرات بیان کرتا ہے۔

حواشی:

1. دکن میں اردو/نصیر الدین ہاشمی، ص۔229، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ اشاعت1969
2. اردو شہ پارے/محی الدین قادری زور، ص۔25، مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد، اشاعت1985
3. مقدمۂ شعر و شاعری/خواجہ الطاف حسین حالی، ص۔189، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، اشاعت1990
4. اردو اصناف کی تدریس/آغا مرزا محمود، ص۔84، قومی اردو کونسل، دہلی
5. اردو کے شخصی مرثیے/لئیق رضوی، ''نیا دور'' لکھنؤ، مئی تا1992 تا جنوری 1993
6. اردو شہ پارے/محی الدین قادری زور، ص۔46، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، اشاعت۔1985
7. ایک مذاکرہ / پروفیسر شارب ردولوی، سہ ماہی ''القلم''، کراچی، ستمبر1999۔

□□□

پتہ:
Department of Urdu, Kidderpore College,
2/3, Pitamber Sircar Lane
Kidderpore, Kolkata-700023

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاق، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب و لہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔

''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/60 روپے

تحریر: بھیشم ساہنی
ترجمہ: خورشید عالم

چیلیں

چیل نے پھر جھپٹا مارا ہے۔ اوپر آسمان میں منڈرا رہی تھی جب یکبارگی نیم دائرہ سی بناتی ہوئی تیزی سے نیچے اتری اور ایک ہی جھپٹے میں گوشت کے لوتھڑے کو پنجوں میں دبوچ کر پھر سے اسی طرح نیم دائرہ بناتی اوپر چلی گئی۔ وہ قبرستان کے اونچے منارے پر جا بیٹھی ہے اور اپنی زرد چونچ، گوشت کے لوتھڑے میں بار بار چبھونے لگی ہے۔

قبرستان کے آس پاس دور تک پھیلے پارک میں ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہے۔ پرانے قبرستان کے کھنڈر جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ اس دھندلکے میں اس کا گول گنبد اور بھی زیادہ وسیع نظر آتا ہے۔ یہ مقبرہ کس کا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی بار بار بھول جاتا ہوں۔ فضا میں پھیلی دھند کے باوجود اس گنبد کا سایہ گھاس کے پورے میدان کو ڈھکے ہوئے ہے جہاں میں بیٹھا ہوں، جس سے فضا کا سونا پن اور بھی بڑھ گیا ہے اور میں بھی خود کو مزید تنہا محسوس کرنے لگتا ہوں۔

چیل منارے پر سے اڑ کر پھر سے آسمان میں منڈرانے لگی ہے، پھر سے نہ جانے کس شکار پر نکلی ہے۔ اپنی چونچ نیچے کیے، اپنی پینی نگاہیں زمین پر لگائے، پھر سے چکر کاٹنے لگی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے اس کے پنکھ لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی ہیئت کسی خوفناک جانور کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔ نہ جانے وہ اپنا نشانہ باندھتی کب اترے، کہاں اترے۔ اسے دیکھتے میں پریشانی سی محسوس کرنے لگتا ہوں۔

کسی واقف کار نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ہم آسمان میں منڈراتی چیلوں کو دیکھ سکتے ہیں لیکن انھی کی طرح فضا میں منڈراتی ان ماورائی چیلوں کو نہیں دیکھ سکتے جو ٹھیک اسی طرح نیچے اتر کر جھپٹا مارتی ہیں اور ایک ہی جھپٹے میں انسان کو لہولہان کر یا تو وہاں پھینک جاتی ہیں یا اس کی زندگی کی سمت ہی بدل دیتی ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جہاں چیل کی آنکھیں اپنے شکار کو دیکھ کر وار کرتی ہیں وہاں وہ ماورائی چیلیں اندھی ہوتی ہیں اور اندھادھند حملہ کرتی ہیں۔ انھیں جھپٹا مارتے ہم دیکھ نہیں پاتے اور ہمیں لگتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں ہم خود بھی کہیں نہ کہیں قصوروار رہے ہوں گے۔ ہم جو ہر حادثے کو وجہ اور کام کی کسوٹی پر پرکھتے رہتے ہیں۔ ہم کہنے لگتے ہیں کہ اپنی تباہی میں ہم خود ہی کہیں نہ کہیں ذمے دار رہے ہوں گے۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے میں اور بھی زیادہ حراساں محسوس کرنے لگا تھا۔

اس نے کہا تھا، ''جس دن میری بیوی کا انتقال ہوا، میں اپنے دوستوں کے ساتھ بغل والے کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ اندر سو رہی ہے۔ میں اسے ایک بار بلانے بھی گیا تھا کہ آؤ، باہر آ کر ہمارے پاس بیٹھو مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ سے پہلے ہی کوئی ماورائی شے اندر داخل ہو گئی ہے اور اس نے میری بیوی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ہم سارا وقت ان ماورائی اشیا سے گھرے رہتے ہیں...''

ارے یہ کیا؟ شوبھا؟ شوبھا پارک میں آئی ہے! ہاں، ہاں شوبھا ہی تو ہے۔ جھاڑیوں کے بیچوں بیچ۔ وہ دھیرے دھیرے ایک طرف بڑھتی آ رہی ہے۔ وہ کب اور کس طرف سے یہاں آئی ہے۔ اس کا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔

میرے اندر جوار سا اٹھا۔ میں خوش ہو گیا۔ میں بہت دن بعد اسے دیکھ رہا تھا۔

شوبھا دبلی ہو گئی ہے، ذرا جھک کر چلنے لگی ہے، لیکن اس کی چال میں ابھی بھی نزاکت ہے۔ وہی دھیمی چال، وہی بانکپن، جس میں اس کی پوری شخصیت منعکس ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ چلتی ہوئی وہ گھاس کا میدان پار کر رہی ہے۔ وہ آج بالوں میں سرخ رنگ کا پھول ٹانکے ہوئے ہے۔

شوبھا، اب بھی تمھارے ہونٹوں پر وہی خوبصورت مسکان کھیل رہی ہوگی جسے دیکھتے میں تھکتا نہیں تھا۔ ہونٹوں کے کونوں میں دبی، سمٹی مسکان۔ ایسی مسکان تو جبھی ہونٹوں پر کھیل سکتی ہے جب تمھارے دل میں ماورائی جذبات کے پھول کھل رہے ہوں۔

دل نے چاہا، بھاگ کر تمھارے پاس پہنچ جاؤں اور پوچھوں، شوبھا، اب تم کیسی ہو؟

بیتے دن کیوں کبھی لوٹ کر نہیں آتے؟ وقت کا پورا حصہ نہ بھی آئے، ایک دن ہی آ جائے، ایک لمحے کے لیے سہی، جب میں تمھیں اپنے قریب پا سکوں، تمھارے پورے وجود کی مہک سے شرابور ہو سکوں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف جانے لگا۔ میں جھاڑیوں درختوں کے درمیان چھپ کر آگے بڑھوں گا تا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو وہ جیسے تیسے قدم بڑھاتی، لمبے لمبے ڈگ بھرتی پارک میں سے باہر نکل جائے گی۔

زندگی کا یہ المیہ ہی ہے جہاں عورت سے زیادہ نازک اور کوئی جاندار نہیں ہوتی، وہیں عورت سے زیادہ بے حس بھی کوئی جاندار نہیں ہوتی۔ میں کبھی کبھی اپنے تعلقات کو لے کر پشیماں بھی ہو جاتا ہوں۔ کئی بار تمھاری طرف سے میری انا کو ٹھیس بھی پہنچ چکی ہے۔

ہماری شادی کے کچھ ہی وقت بعد تم مجھے اس بات کا احساس کرانے لگی تھی کہ یہ شادی تمھاری توقعات کے مطابق نہیں ہوئی ہے اور تمھاری طرف سے ہمارے تعلقات میں ایک طرح کا ٹھنڈا پن آنے لگا تھا لیکن میں ان دنوں تم پر نچھاور تھا، متوالا بنا گھومتا تھا۔ ہمارے درمیان کسی بات کو لے کر من مٹاؤ ہو جاتا اور تم روٹھ جاتی تو میں تمھیں منانے کی حتی الامکان کوشش کیا کرتا، تمھیں ہنسانے کی۔ اپنے دونوں کان پکڑ لیتا، ''کہو تو سجدہ ریز ہو کر زمین پر ناک سے لکیریں بھی کھینچ دوں؟ زبان نکال کر بار بار سر ہلاؤں؟'' اور تم پہلے تو منہ پھلائے، میری طرف دیکھتی رہتی، پھر اچانک کھل کھلا کر ہنسنے لگتی بالکل بچوں کی طرح جیسے تم ہنسا کرتی تھی اور کہتی: ''چلو معاف کر دیا۔''

اور میں تمھیں بانہوں میں بھر لیتا تھا۔ میں تمھاری سریلی آواز سنتے نہیں تھکتا تھا۔ میری آنکھیں تمھارے چہرے پر، تمھاری کھلی پیشانی پر لگی رہتیں اور میں تمھارے دل کے احساسات پڑھتا رہتا۔

عورت مرد کے رشتے میں کچھ بھی تو واضح نہیں ہوتا، کچھ بھی تو منطقی نہیں ہوتا۔ جذبات کی دنیا کے اپنے دستور ہیں یا شاید کوئی بھی دستور نہیں۔

ہمارے درمیان رشتوں کی کھائی چوڑی ہوتی گئی، پھیلتی گئی۔ تم اکثر کہنے لگی تھی، ''مجھے اس شادی میں کیا ملا؟'' اور میں جواب میں تنک کر کہتا:

''میں نے کون سے ایسے گناہ کیے ہیں کہ تم سارا وقت منہ پھلائے رہو اور میں ہر وقت تمھاری دلجوئی کرتا رہوں؟ اگر ایک ساتھ رہنا تمھیں راس نہیں آ رہا تھا تو پہلے ہی مجھے چھوڑ جاتی۔ تم مجھے کیوں نہ چھوڑ کر چلی گئی؟ تب آئے دن نہ تو تمھیں الاہنے دینے پڑتے اور نہ ہی مجھے سننے پڑتے۔ اگر گرہستی میں تم میرے ساتھ گھسٹتی رہی ہو، تو اس کا قصوروار میں نہیں ہوں، خود تم ہو۔ تمھاری بے رخی مجھے کچوٹتی رہتی ہے۔ پھر بھی تم خود کو دکھیاری، مظلومہ سمجھتی رہتی ہو۔''

جی میں آیا، میں اس کے پیچھے نہ جاؤں۔ لوٹ آؤں اور بنچ پر بیٹھ کر اپنے من کو شانت کروں۔ میری ذہنی کیفیت کیسی ہو گئی ہے۔ خود کو کوستا ہوں تو بھی بے چین اور تمھیں کوستا ہوں تو بے قرار۔ میرا سانس پھول رہا تھا، پھر بھی میں تمھاری طرف دیکھتا کھڑا رہا۔

سارا وقت تمھارا راستہ تاکتے رہنا، سارے وقت لیپا پوتی کرتے رہنا، خود کو ہر بات کے لیے ذمے دار ٹھہراتے رہنا، میری، بہت بڑی بھول تھی۔

پٹری سے اتر جانے کے بعد ہماری گرہستی گھسٹنے لگی تھی لیکن جہاں شکوے شکایت، جھلاہٹ، فاصلے، بے دلی، نکیلے کنکر پتھروں کی طرح ہمارے جذبات کو کریدنے، کاٹنے لگے تھے، وہیں کبھی کبھی شادی شدہ زندگی کے ابتدائی دنوں جیسے آسان میل ملاپ بھی لہراتے سمندر کے درمیان کسی جھلملاتے جزیرے کی طرح ہماری زندگی میں سکھ کے کچھ لمحے بھر دیتے۔

لیکن مجموعی طور پر ہمارے آپسی رشتوں میں سرد مہری آ گئی تھی۔ تمھاری مسکان اپنی جاذبیت کھو بیٹھی تھی۔ تمھاری کھلی پیشانی کبھی کبھی تنگ لگنے لگی تھی اور جس طرح باتیں سنتے ہوئے تم سامنے کی طرف دیکھتی رہتیں، لگتا تمھارے پلے کچھ نہیں پڑ رہا ہے۔ ناک نقش وہی تھے، ادائیں بھی وہی تھیں لیکن ان کا جادو غائب ہو گیا تھا۔ جب شوبھا آنکھیں مچ مچاتی ہے... میں دل ہی دل میں کہتا... تو بڑی بے وقوف لگتی ہے۔

میں نے پھر سے نگاہ اٹھا کر دیکھا، شوبھا نظر نہیں آئی۔ کیا وہ پھر سے درختوں، جھاڑیوں کے درمیان آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے؟ دیر تک اس طرف دیکھتے رہنے پر بھی، جب وہ نظر نہیں آئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے لگا جیسے وہ وہاں پر نہیں ہے۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ کیا شوبھا وہاں پر تھی یا کہ یہ میرا وہم ہے؟ میں دیر تک آنکھیں ٹکائے اس طرف دیکھتا رہا جس طرف وہ مجھے نظر آئی تھی۔

اچانک مجھے پھر سے اس کی ایک جھلک ملی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے بھی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی رہی تھی۔ مجھے پھر سے ایک خوشی کا احساس ہوا۔ ہر بار جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی، تو میرے اندر اٹھنے والے طرح طرح کے جذبات کے باوجود، پارک پر سوناپن سا اتر آتا لیکن اب کی بار اس پر نگاہ پڑتے ہی دل بے چین سا ہو گیا۔ شوبھا پارک میں سے نکل جاتی تو؟

ایک تیز سی لہر میرے اندر پھر سے اٹھی۔ اسے مل پانے کے لیے دل میں ایسی بے چینی سی پیدا ہوئی کہ سبھی گلے شکوے، کورے کرکٹ کی طرح اس میں بہہ سے گئے۔ سبھی شکایتیں بھول گئے۔ یہ کیسے ہوا کہ شوبھا پھر سے مجھے شادی کے پہلے دنوں والی شوبھا نظر آنے لگی تھی۔ اس کے باوجود کی ساری کشش پھر سے لوٹ آئی تھی اور میرا دل پھر سے بھر گیا۔ دل میں بار بار یہی آواز اٹھتی:

''میں تمھیں کھو نہیں سکتا۔ میں تمھیں کبھی بھی کھو نہیں سکتا۔''

یہ کیسے ہوا کہ پہلے والے جذبے پوری شدت سے پھر سے میرے اندر سر ابھارنے لگے تھے۔

میں نے پھر سے شوبھا کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ہاں، ایک بار دل میں سوال ضرور اٹھا، کہیں میں پھر سے خود کو دھوکہ تو نہیں دے رہا ہوں؟ کیا معلوم وہ پھر سے مجھے ٹھکرا نہ دے؟

لیکن نہیں، مجھے لگ رہا تھا جیسے شادی کے بعد کی تکرار اور آپسی رنجش کا وہ

سارا عرصہ ایک فریب تھا، جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ میں برس بعد تمھیں انھی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، جن آنکھوں سے تمھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں پھر سے تمھیں اپنی بانہوں میں بھر لینے کے لیے بے چین و بے قرار ہو اٹھا تھا۔

تم رفتہ رفتہ جھاڑیوں کے درمیان آگے بڑھتی جارہی تھی۔ تم پہلے کی بہ نسبت دبلی ہوگئی تھی اور مجھے کمزور د تنہا سی لگ رہی تھی۔ اب کی بار تم پر نظر پڑتے ہی میرے دل کی ساری کدورت ریت کی دیوار کی طرح گر گئی تھی۔ تم اتنی دبلی، اتنی بے بس سی لگ رہی تھی کہ میں بے چین ہو اٹھا اور خود پر ملامت بھیجنے لگا۔ تمھاری سُبک سی شبیہہ کبھی ایک جھاڑی کے پیچھے تو کبھی دوسری جھاڑی کے پیچھے چھپ جاتی۔ آج بھی تم بالوں میں سرخ پھول لگانا نہیں بھولی تھیں۔

عورتیں دل سے بے قرار بے چین رہتے ہوئے بھی بن سنور کر رہنا نہیں بھولتیں۔ عورت اگر دل سے بے قرار بھی ہوگی تو بھی صاف ستھرے کپڑے پہنے، بجے سنورے بال، ناک نقش سے درست ہوکر باہر نکلے گی۔ جب کہ مرد، قسمت کا ایک ہی تھپیڑا کھانے پر پھوہڑ ہوجاتا ہے۔ بال الجھے ہوئے، چہرے پر بڑھتی داڑھی، کپڑے مسلے ہوئے اور آنکھوں میں ویرانی لیے بھکاریوں کی طرح گھر سے باہر نکلے گا۔ جن دنوں ہمارے درمیان مَن مُٹاؤ ہوتا اور تم اپنی قسمت کو کوستی گھر سے باہر نکل جاتی تھی، تب بھی سلیقے سے کپڑے پہننا اور چُست درست بن کر جانا نہیں بھولتی تھیں۔ ایسے دنوں میں بھی تم باہر آنگن میں لگے گلاب کے پودے میں سے چھوٹا سا سرخ گلاب بالوں میں لگانا نہیں بھولتی تھیں۔ جب کہ میں دن بھر ہانپتا، کسی جانور کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکر کاٹتا رہتا تھا۔

تمھاری شال تمھارے دائیں کندھے پر سے کھسک گئی تھی اور اس کا ایک سرا زمین پر تمھارے پیچھے پیچھے گھسٹنے لگا تھا، لیکن تمھیں اس کا احساس نہیں ہوا۔ کیونکہ تم پہلے کی ہی طرح خراماں خراماں چلتی جارہی تھی۔ کندھے ذرا آگے کو جھکے ہوئے، کندھے پر سے شال کھسک جانے سے تمھاری سڈول گردن اور زیادہ واضح نظر آنے لگی تھی۔ کیا معلوم تم کن خیالوں میں کھوئی چلی جارہی ہو۔ کیا معلوم تم بھی ہمارے بارے میں، ہمارے ترک تعلقات کے بارے میں ہی سوچ رہی ہو۔ کون جانے کسی داخلی تحریک کے تحت مجھے ہی پارک میں مل جانے کی امید لے کر تم یہاں چلی آئی ہو۔ کون جانے تمھارے دل میں ایسی ہی کسک، ایسی چھٹ پٹاہٹ اٹھی، جیسی میرے دل میں۔ کیا معلوم قسمت ہم دونوں پر مہربان ہوگئی ہو.... اور نہیں تو میں تمھاری آواز تو سن پاؤں گا۔ تمھیں آنکھ بھر دیکھ تو پاؤں گا۔ اگر میں اتنا بے چین ہوں تو تم بھی تو بے حد اکیلی ہو اور نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی ہو۔ آخری بار، ترک تعلقات سے پہلے، تم ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی تھی۔ تب تمھاری آنکھیں مجھے بڑی بڑی سی لگی تھیں، لیکن میں انھیں سمجھ نہیں سکا تھا۔ تم کیوں میری طرف دیکھ رہی تھی اور کیا سوچ رہی تھی، تم نے کیوں نہیں مجھ سے کچھ بھی کہا؟ مجھے لگا تھا تمھاری ساری شکایتیں سمٹ کر تمھاری آنکھوں میں آگئی تھیں۔ تم مجھے ایک بے حس مورتی سی لگ رہی تھی اور اس شام جیسے تم نے مجھے چھوڑ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میں حسب معمول شام کو گھومنے چلا گیا تھا۔ دل و دماغ پر بھلے کتنا ہی بوجھ ہو، میں اپنا معمول نہیں بدلتا۔ لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب میں گھر واپس لوٹا تو ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی مجھے اپنا گھر سونا سونا سا لگا تھا، اور اندر جانے پر پتہ چلا کہ تم جا چکی ہو۔ تبھی مجھے تمھاری وہ ایک ٹک نظر یاد آئی تھی، میری طرف دیکھتی ہوئی۔

تمھیں گھر میں نہ پاکر پہلے تو میری انا کو دھچکا سا لگا تھا کہ تم جانے سے پہلے نہ جانے کیا سوچتی رہی ہو، اپنے دل کی بات زبان تک نہ لاسکی لیکن جلد ہی اس ویران گھر میں بیٹھا میں جیسے اپنا سر دھننے لگا تھا۔ گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا تھا۔

اب تم دھیرے دھیرے گھاس کے میدان کو چھوڑ کر چوڑی پگڈنڈی پر آگئی تھی جو مقبرے کا طواف کرتی ہوئی سی پارک کے داخلی دروازے کے پاس کی طرف جانے والے راستے سے جا ملتی ہے۔ جلد ہی تم چلتی ہوئی پارک کے گیٹ تک پہنچ جاؤ گی اور آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ گی۔

تم مقبرے کا وہ کونا کاٹ کر اس چوکور میدان کی طرف جانے لگی ہو جہاں بہت سارے بنچ رکھے رہتے ہیں اور بڑی عمر کے تھکے ہارے لوگ ستانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔

کچھ دور جانے کے بعد تم پھر سے ٹھٹکی تھی۔ موڑ آگیا تھا اور موڑ مڑنے سے قبل تم نے مڑ کر دیکھا تھا۔ کیا تم میری طرف دیکھ رہی ہو؟ کیا تمھیں اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ میں پارک میں پہنچا ہوا ہوں اور دھیرے دھیرے تمھارے پیچھے چلا آرہا ہوں؟

کیا واقعی اسی وجہ سے ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی ہو، اس امید پر کہ میں بھاگ کر تم سے جا ملوں گا؟ کیا یہ میرا وہم ہے یا تمھاری نسائی جھجک کہ تم چاہتے ہوئے بھی میری طرف قدم نہیں بڑھاؤ گی؟

لیکن کچھ لمحے تک ٹھٹھکے رہنے کے بعد تم پھر پارک کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

میں نے تمھاری طرف قدم بڑھا دیے۔ مجھے لگا جیسے میرے پاس گنے چنے کچھ لمحے ہی رہ گئے ہیں جب میں تم سے مل سکتا ہوں۔ اب تمھیں مل سکا تو کبھی نہیں مل سکوں گا اور نہ جانے کیوں یہ سوچ کر میرا گلا روندھنے لگا تھا۔

لیکن میں ابھی کچھ ہی قدم آگے کی طرف بڑھا تھا کہ زمین پر کسی بھاگتے

سایے نے میرا راستہ کاٹ دیا۔ لمبا چوڑا سایہ، تیرتا ہوا سا، میرے راستے کو کاٹ کر نکل گیا تھا۔ میں نے نظر اوپر اٹھائی اور میرا دل بیٹھ گیا۔ چیل ہمارے سر کے اوپر منڈرائے جارہی تھی۔ کیا یہ چیل ہی ہے؟ لیکن اس کے پنکھ کتنے بڑے ہیں اور لمبی پیلی چونچ، آگے کو مڑی ہوئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی پنی آنکھوں میں خوفناک سی چمک ہے۔

چیل آسمان میں ہمارے اوپر چکّر کاٹنے لگی تھی اور اس کا سایہ بار بار میرا راستہ کاٹ رہا تھا۔

اُف! یہ تم پر نہ کہیں جھپٹ پڑے۔ میں بدحواس سا تمھاری طرف دوڑنے لگا، جی چاہا چیخ کر تمھیں آگاہ کردوں، لیکن پنکھ پھیلائے چیل کو منڈراتا دیکھ کر میں اس قدر پریشان ہوگیا تھا کہ منہ سے لفظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔ میرا گلا سوکھ رہا تھا اور پاؤں بوجھل ہورہے تھے۔ میں جلد سے جلد تم تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن مجھے لگا جیسے میں اس سایے کو پھلانگ ہی نہیں پارہا ہوں۔ چیل ضرور نیچے آنے لگی ہوگی، جو اس کا سایہ اس قدر پھیلتا جارہا ہے کہ میں اسے پھلانگ ہی نہیں سکتا۔

میرے ذہن میں ایک ہی جملہ بار بار گھوم رہا تھا کہ تمھیں اس منڈراتی چیل کے بارے میں آگاہ کردوں اور تم سے کہوں کہ جتنی جلدی پارک میں سے نکل سکتی ہو نکل جاؤ۔

میری سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پارہا تھا۔

باہر جانے والے گیٹ سے تھوڑا ہٹ کر، دائیں طرف ایک اونچا سا مینار ہے جس پر کبھی مقبرے کی رکھوالی کرنے والا پہریدار کھڑا رہتا ہوگا۔ اب وہ مینار بھی ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہے۔

جس وقت میں سایے کو پھلانگ پانے کی حتی الامکان کوشش کررہا تھا اس وقت مجھے لگا تھا جیسے تم چلتی ہوئی اس مینار کے پیچھے جا پہنچی ہو۔ پل بھر کے لیے میں مطمئن سا ہوگیا۔ تمھیں اپنے سر کے اوپر منڈراتے خطرے کا احساس ہوگیا ہوگا۔ نہ بھی ہوا ہو تو بھی تم نے باہر نکلنے کا جو راستہ اپنایا تھا وہ زیادہ محفوظ تھا۔

میں تھک گیا تھا۔ میری سانس بری طرح سے پھولی ہوئی تھی۔ لاچار، میں اس مینار کے قریب ایک پتھر پر ہانپتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہ گیا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی تم مینار کے پیچھے سے نکل کر سامنے آؤگی میں چیخ کر تمھیں پارک میں سے نکل بھاگنے کی التجا کروں گا۔ چیل اب بھی سر پر منڈرائے جارہی تھی۔

تبھی مجھے لگا تم مینار کے پیچھے سے باہر آئی ہو۔ ہوا کے جھونکے سے تمھاری ساڑی کا پلو لہرایا ہے۔ تمھارے پاؤں زمین پر سے اٹھے ہیں اور ہوا میں اٹھکھیلیاں سی کرتی ہوئی تم سیدھا گیٹ کی طرف بڑھنے لگی ہو۔

''شوبھا!'' میں چلّایا۔

لیکن تم بہت آگے بڑھ چکی تھی، لگ بھگ گیٹ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ تمھاری ساڑی کا پلو ابھی بھی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ بالو میں سرخ پھول کھلا ہوا سا لگ رہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور جیسے تیسے قدم بڑھاتا تمھاری طرف جانے لگا۔ میں تم سے کہنا چاہتا تھا: ''اچھا ہوا جو تم چیل کے پنجوں سے بچ کر نکل گئی ہو شوبھا!''

گیٹ کے پاس تم رکی تھی اور مجھے لگا تھا جیسے میری طرف دیکھ کر مسکرائی ہو اور پھر پیٹھ موڑ لی تھی اور آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

میں بھاگتا ہوا گیٹ کے پاس پہنچا تھا۔ گیٹ کے پار میدان میں ہلکی ہلکی دھول اڑ رہی تھی اور پارک میں آنے والوں کے لیے چور سا کھلا راستہ سائیں، سائیں کررہا تھا۔

تم پارک میں سے صحیح سلامت نکل گئی ہو، یہ سوچ کر میں اطمینان سا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا، چیل وہاں پر نہیں تھی۔ چیل جا چکی تھی۔ آسمان صاف تھا اور ہلکی دُھند کے باوجود اس کا نیلا پن جیسے لوٹ آیا تھا۔

□□□

پتہ:
F-58, Sector 40, NOIDA-201301

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی
Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in
قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

اقبال محی الدین

صوتی آلودگی اور ہماری ذمے داریاں

آبادی کے اضافے، شہروں کے پھیلاؤ اور صنعت و حرفت کی وسعت نے ہمارے ماحول کو بہت متاثر کیا ہے۔ معاشی و صنعتی ترقیات کی دوڑ میں موٹر گاڑیوں کا بھی اہم رول رہا ہے جن سے انسانی زندگی کو متاثر کرنے والے کیمیائی اجزا، ہماری زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ دراصل ترقیاتی پروجیکٹس کے ساتھ آلودگی جڑی ہوئی ہے۔ ہوا اور پانی کی کثافت ہی انسانی زندگی کے لیے کیا کم تھی کہ ان موٹر گاڑیوں کے نکلتے ہوئے دھوئیں اور شور سے اور بھی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔

زمین کے اوپر ہوا کی پرت میں غیر مطلوبہ تبدیلی جو گیسوں کے نکلنے کی وجہ سے ہوتی ہے، پورے ماحول کو متاثر کرتی رہتی ہے، ایسی متاثر شدہ ماحولیات کو ماحول کی کثافت کہتے ہیں۔ ماحولیاتی کثافت انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگیوں کو متاثر کرتی ہے۔ یہ ماحولیاتی کثافت پانچ اجزا سے پیدا ہوتی ہے۔ کاربن مونو آکسائڈ، ہائیڈرو کاربن، نائیٹروجن آکسائڈ، سلفر آکسائڈ اور Particulates۔ ان کے علاوہ کچھ اور اجزا بھی ہوا میں پائے جاتے ہیں جن سے کثافت پھیلتی ہے۔ 1960 میں ماحولیاتی کثافت کا مسئلہ ساری دنیا کے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک نے سائنسی تجربات کرنے شروع کیے تاکہ ماحولیاتی کثافت کم سے کم کی جاسکے اور لوگوں کی زندگیوں کو کم سے کم نقصان پہنچے۔

آواز دراصل ہوا میں لہر اور حرکت کا نام ہے جس کی ضربیں کان کی جھلی پر پڑتی ہیں اور پھر اس کا ارتعاش پیغام میں منتقل کر کے دماغ کی طرف بھیج دیا جاتا ہے۔ آواز کی خاصیت یہ ہے کہ ہوا میں مجتمع نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر گھنٹی بجایئے یا اپنے کسی دوست سے سرگوشی کیجیے۔ سیکنڈ کے تقریباً ہزارویں حصے میں آواز اپنا وجود کھو چکی ہوگی لیکن اس کے برعکس تیز آوازیں انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں اور ان کے اثرات بہ آسانی رفع بھی نہیں ہوتے۔

خفیف ترین آواز جسے ہم سن سکتے ہیں اس کی پیمائش صفر ڈیسی بل (odB) سے کی جاتی ہے۔ شور کی انتہائی حدود مثلاً راکٹ کی پرواز، میدانِ کارزار کا شور، زمین پر پانی ٹپکنے کی آواز سے ہزاروں گنا زیادہ ہوتا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے شور کی محفوظ حد 45 ڈیسی بل مقرر کی ہے جبکہ دہلی اور ممبئی جیسے شہروں میں شور کی سطح بالعموم 85 سے 110 ڈیسی بل کے درمیان ہوتی ہے۔

شور کو غیر مطلوبہ آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شور ہمارے ترسیلی نظام میں مداخلت کرسکتا ہے۔ اس سے نہ صرف عضوی بلکہ نفسیاتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں جن سے عادات و اطوار میں بھی فرق آجاتا ہے جن کا بہت سے ممالک میں گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے اور تیز آواز پر کنٹرول کرنے کا قانون سختی سے نافذ کیا جارہا ہے۔

اچانک دھماکہ خیز آواز سے سماعت وقتی یا دائمی طور پر رخصت ہوسکتی ہے۔ پونا میں ماحولیاتی مطالعے سے ثابت ہوا ہے کہ ان کے خطۂ تحقیق میں 80 فیصد ٹریفک کارکن سماعت کے خلل میں مبتلا ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ شدید نفسیاتی مسائل سے بھی دوچار تھے۔ حالیہ اندازوں کے مطابق کارخانوں میں کام کرنے والے 8 میلین افراد میں سے ڈیڑھ میلین افراد مخل سماعت میں مبتلا ہو چکے ہوتے ہیں۔

شہری شور کی عمومی سطح عمر بڑھنے کے ساتھ ہمیں بتدریج بہرا کردینے کے لیے کافی ہے۔ اس طرح کے شور کی عدم موجودگی کی صورت میں عمر بڑھنے کے باوجود سماعت کا خراب ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ پرسکون مقام پر رہنے والوں میں 70 سال کی عمر میں بھی سماعت اتنی ہی اچھی رہتی ہے جتنی پُرشور شہروں میں 20 سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق راک اینڈ رول موسیقی نقصان دہ حد تک تیز ہوتی ہے۔ جو بہرا پن پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ 135 ڈیسی بل آواز کا تجربہ قلیل ترین مدت کے لیے بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کے زیرِ اثر سماعت حتمی طور پر برباد ہوجاتی ہے۔ 150 یا 160 ڈیسی بل تک آواز کی سطح بڑھ جانے کی صورت میں کان کی جھلی اس حد تک پھٹ سکتی ہے کہ اس کی مرمت ممکن نہیں ہوتی۔

صوتی آلودگی کی وجہ سے کارخانوں میں کام کرنے والوں میں بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ رفتار قلب اور قلب میں کارٹی زون سطح بھی بڑھ جاتی ہے۔ دباؤ، تھکن اور نیند کم آنے کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ جتنی زیادہ صوتی آلودگی کی سطح بڑھتی جائے گی انسان کی کارکردگی کی سطح گرتی جائے گی۔

سائنس داں آر. کے. اروڑہ کی رپورٹ کے مطابق ماحولیاتی کثافت اور صوتی آلودگی بڑے شہروں میں زیادہ ہے۔ جہاں پر ڈیزل اور پٹرول سے چلنے والی گاڑیاں زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔ انھوں نے کولکاتا اور جے پور کی مثال دی

کہ کولکاتا میں صوتی آلودگی بہت زیادہ ہے بہ مقابلہ جے پور کی کولکاتا میں 1299 ٹن Air Pollutants روزانہ نکلتا ہے جس سے فضائی آلودگی اور صوتی آلودگی بہت زیادہ پھیلتی ہے۔ ممبئی میں 1600 ٹن Air Pollutants روزانہ نکلتے ہیں جس سے فضائی کثافت دن بہ دن بڑھتی جاتی ہے۔ ممبئی اور دہلی میں فیکٹریوں، موٹر گاڑیوں اور ٹرینوں کے شور وغل سے صوتی آلودگی بڑھتی جارہی ہے جو ہمارے دل و دماغ اور جسم کے دوسرے حصوں اور خاص طور سے کانوں کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر کامیش ڈرن کے مطابق چنئی، کوئم بتور، مدورائی، کوچین اور تھیروانتھاپورم میں صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے ہر چار آدمیوں میں سے ایک آدمی صوتی آلودگی کا شکار ہوکر اپنے سننے کی قوت گنوا بیٹھا ہے۔

اب اس بات پر ریسرچ ہورہی ہے کہ صوتی آلودگی کو کس طرح کنٹرول کیا جائے۔ دہلی میں ہر سڑک پر ہزاروں بسیں، موٹر کاریں، اسکوٹر، تھری وہیلر اور ٹرک وغیرہ چلتے نظر آتے ہیں۔ یہ گاڑیاں دھواں تو خارج کرتی ہی ہیں جس سے فضائی کثافت پیدا ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ اس قدر شور وغل کرتی ہیں کہ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ ایسی کثیف فضا میں انسانوں کو صحت مند رہنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے دہلی گورنمنٹ نے ہر بس میں Speed Governors لگانے کا حکم جاری کیا ہے تاکہ بسیں ایک خاص رفتار سے آگے نہ دوڑ سکیں۔ شور وغل کو قابو میں لانے کی اور بھی احتیاطیں کی گئی ہیں۔

صوتی آلودگی کے اس ماحول میں ہماری کیا ذمے داریاں ہیں، یہ بات غور طلب ہے۔ ہمیں ایسی تدابیر کرنا چاہئیں جن سے صوتی آلودگی کم سے کم پیدا ہو۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال صرف ضرورت کے وقت ہی ہونا چاہیے اور ایسے وقت ہو جب لوگوں کو اس کی آواز سے تکلیف نہ ہو۔

کارخانوں میں کام کرنے والوں کے لیے مالکان کارخانہ سے پُر اثر طور پر بات کرنا چاہیے کہ وہ مشین کی آواز کو کم سے کم سطح پر رکھیں۔ پرانی مشینیں بدل کر نئی مشینیں لگائی جائیں۔ شہروں کی گھنی آبادی سے کارخانوں کو ہٹا کر دور تنہائی والے علاقوں میں لگانا چاہیے تاکہ مشینوں کی کرخت آواز سے لوگ متاثر نہ ہوں۔

بسوں اور موٹر گاڑیوں کی وجہ سے جو صوتی آلودگی پیدا ہوتی ہے اس کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے Speed Governors لگانا ضروری ہے تاکہ نہ تو ان کی رفتار بڑھنے پائے جس سے شور وغل زیادہ ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا دھواں فضا کو زیادہ آلودہ کرے۔ ہماری یہ ذمے داری ہے کہ لوگوں کو صوتی آلودگی کے بارے میں بتائیں اور اس کے نقصانات سے انھیں آگاہ کریں۔ اس طرح لوگوں میں صوتی آلودگی کے بارے میں بیداری پیدا ہوسکے گی۔ حکومت کی ہماری مشترکہ کوشش سے صوتی آلودگی ختم ہوسکتی ہے اور ہم ایک بہتر ماحول پیدا کرنے میں معاون ہوسکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartment, Near Shamshad Market,
Aligarh Muslim University, Aligarh-202002

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم ورواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد عبداللطیف

خلائی سفر قدم بہ قدم

آج جب ہم اپنے اطراف و اکناف پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں اپنے چاروں طرف اَن گنت نئی نئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ آج دنیا میں خبر رسانی اور ترسیل کی جو سہولتیں موجود ہیں کبھی ان کا تصور بھی مشکل تھا لیکن ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، سیل فون، فیکس، ای میل اور انٹرنیٹ جیسی ایجادات نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل کردیا ہے۔ مصنوعی سیارے (Artificial Satellites) جو خلا میں گردش کررہے ہیں۔ جو ان نئی ایجادات کے فروغ میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔

اسحاق نیوٹن پہلا سائنس داں تھا جس نے خلائی سفر کی راہ دکھائی۔ دراصل نیوٹن کا کلیہ عمل اور ردِعمل (Law of Action-Reaction) علم طبیعیات میں ایک نیا موڑ ہی نہیں بلکہ خلائی سفر کی نئی راہ دکھانے والا بھی تھا۔ نیوٹن نے اپنے کلیے میں یہ بتایا ہے کہ دراصل کششِ ثقل (زمین کی کشش)، خلا تک پہنچنے میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر ہم اس کششِ ثقل سے نکل جائیں تو آسانی سے خلا میں پہنچا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے ایک چینی سائنس داں وان ہو (Wanhu) نے فائر راکٹ کے ذریعے خلا میں پہنچنے کی ناکام کوشش کی اور وہ حادثے کا شکار ہوکر جاں بحق ہوگیا۔ لیکن سائنس دانوں کو خلائی سفر کے لیے گاڑی بنانے کا طریقہ سوجھ گیا۔

مصنوعی سیاروں کا دور 1957 سے شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے روس نے اسپتنک اوّل (sputnik-I) نامی مصنوعی سیارہ فضا میں بھیجا۔ یہ سیارہ چاند کی طرح زمین کے اطراف گردش کرنے لگا۔ روس کی یہ پہلی مہم کامیاب ثابت ہوئی۔ پھر اس کے بعد امریکا نے کئی ایک مصنوعی سیارے فضا میں چھوڑے اور ان سیاروں کے ذریعے کافی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ ان معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں نے کسی جاندار مخلوق کو خلا میں بھیجنے کا پروگرام بنایا۔ اس ضمن میں پھر ایک بار روس دوسرے ممالک پر سبقت لے گیا۔ اس نے اپنا دوسرا خلائی راکٹ اسپتنک دوم (sputnik II) خلا میں داغا۔ اس خلائی راکٹ میں ایک کتیا جس کا نام لائیکا (Laika) تھا سوار تھی۔ وہ تقریباً ایک ہفتے تک خلا میں رہی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ انسان کو اگر ضروری سامان مہیا کردیا جائے تو وہ بھی خلا پر پہنچ سکتا ہے۔

انسان کو خلا میں بھیجنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ خلا میں کسی چیز کا وزن نہیں ہوتا۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے انسان کو ایک خاص ماحول کا عادی بنایا گیا تاکہ وہ بے وزنی کی کیفیت سے آسانی سے گزر سکے۔ صرف خلا کے جس حصے میں سورج اور اس کی شعاعیں نزدیک ہوتی ہیں وہاں غضب کی گرمی ہوتی ہے اور جہاں سورج اور اس کی شعاعیں دور ہوتی ہیں وہاں سخت سردی ہوتی ہے۔ ان دشواریوں پر قابو پانے کے لیے ایک خاص قسم کا خلائی لباس تیار کیا گیا جسے پہن کر خلا باز ٹھیک ٹھاک رہ سکتے تھے۔

پہلا انسان جس نے 12 اپریل 1961 کو خلائی جہاز ووسٹک اوّل (Vostok I) میں خلائی سفر کیا وہ یوری گگارین (Yuri Gagarin) تھا جسے روس نے خلا میں بھیجا تھا۔ پہلی خلائی مسافر عورت ویلنٹینا ٹورسکوا (Valentina Tereshkova) تھی۔ پہلا آدمی جو چاند پر چلا پھرا نیل آرم اسٹرانگ (Neil Armstrong) امریکا تھا۔ اس نے 21 جولائی 1969 کو امریکی خلائی جہاز اپالو گیارہ میں سفر کرتے ہوئے چاند کی سرزمین پر قدم رکھا۔ پہلا ہندوستانی جس نے خلائی سفر کیا وہ راکیش شرما ہیں۔

خلائی سائنس میں ہندوستان ایک اہم حصہ دار ہے۔ خلا کی تحقیق کے لیے 1961 میں انڈین نیشنل کمیٹی قائم ہوئی۔ اس کے صدر ڈاکٹر وکرم سارا بھائی تھے۔ ہندوستان نے 19 اپریل 1975 کو اپنا پہلا مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ خلا میں داغا۔ اسے ایک روسی راکٹ کے ذریعے خلا میں پہنچایا گیا تھا۔ زمین سے اس کا رابطہ صرف پانچ دنوں تک قائم رہا۔ اس کے بعد پھر ایک مشاہداتی سیارہ بھاسکر 7 جون 1979 کو روسی راکٹ کی مدد سے خلا میں داغا گیا۔ یہ تجربہ کسی حد تک کامیاب ثابت ہوا کیونکہ دو برس تک اس نے اپنا کام انجام دیا۔

1980 سے ہندوستانی سائنس دانوں نے خود اپنے بنائے ہوئے راکٹ کے ذریعے مصنوعی سیاروں کو خلا میں چھوڑنے کا آغاز کیا۔ اپریل 1983 میں مصنوعی سیارہ روہنی۔ 2 شری ہری کوٹہ (آندھرا پردیش) سے ہندوستانی راکٹ کی مدد سے خلا میں داغا گیا۔ خلائی سفر میں ہندوستان کی یہ کامیابی ایک اہم سنگ میل تھی۔

ہندوستان مصنوعی سیارے چھوڑنے والا چھٹا ملک ہے۔ وہ اب تک

روہنی-II" Apple (19 جون 1981)، Insat-1A (10 اپریل 1982)، I.R.S.-1A (17 مارچ 1988)، INSAT-2B (10 جولائی 1992)، INSAT-3B (22 مارچ 2000)، GSAT-1 (18 اپریل 2001)، 2B)، Resourse-SAT-1 ستمبر 2003)، EDUSAT (20 ستمبر 2004)، CARTOSAT and HAMSAT (105 مئی 2005)، (2007-08 RISAT-1 خلا میں بھیج چکا ہے۔

خلائی پروازوں کا مقصد تکنیکی برتری اور سیاسی بالادستی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ ان مصنوعی سیاروں کے ذریعے زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے فلاح و بہبود کے امکانات کو بڑھاوا دینا ہے۔ اس وقت مختلف قسم کے مصنوعی سیارے خلا میں گروش کر رہے ہیں۔ اس میں سے چند یہ ہیں:

1. مشاہداتی مصنوعی سیارے: یہ سیارے زمین کے ان مقامات کے بارے میں اطلاعات مہیا کرتے ہیں جو انسانی نظروں سے ابھی تک اوجھل رہے ہیں۔ ان سیاروں کی مدد سے معدنیاتی ذخائر، برفانی علاقوں، جنگلات، پہاڑوں اور آتش فشانوں کی صحیح نشاندہی ہوتی ہے۔

2. موسمی مصنوعی سیارے: یہ موسم کے بارے میں اطلاع پہنچاتے ہیں۔ ان میں ٹیلی ویژن کیمرے لگے ہوتے ہیں۔ زمین کے اوپر جہاں بادل جمع ہوگئے ہوں یہ ان کی تصاویر زمین تک بھیجتے ہیں۔ دوسرے آلات درجۂ حرارت ہوا کے رخ اور رفتار، ہوا کے دباؤ کی اطلاع دیتے ہیں۔ سائنس داں ان تصاویر کا مطالعہ کرتے ہیں اور موسم کی پیش قیاسی کرتے ہیں۔

3. مواصلاتی یا خبررساں مصنوعی سیارے: یہ سیارے زمین کے اطراف، موسم کے سیاروں سے زیادہ اونچائی پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی مدد سے ان گنت ٹیلی فون لائنوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور آن واحد میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو دور دراز علاقوں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

4. تحقیقاتی مصنوعی سیارے: یہ سیارے سیارچوں کی دریافت اور خلائی تحقیق کے لیے چھوڑے گئے ہیں۔ ان سیاروں کے ذریعے کائنات کے وہ راز معلوم ہوتے ہیں جو ابھی تک انسانی علم میں نہیں آئے۔

ہندوستانی سائنس دانوں نے 1975 سے 2007 تک تقریباً 33 سال کی مدت میں کل 44 مصنوعی سیارے خلا میں داغے جن میں 35 کامیاب اور 9 ناکام۔ ان میں پانچ سائنسی سیارے، 4 زمینی معائنے، Earth Observation) کے، 7 مواصلاتی (Communication) سیارے، 7 کثیرالمقاصد (Multipurpose) سیارے، 2 ٹیکنالوجی سیارے، Remote Sensing سیارے، 5 ٹیلی کام (Telecom) سیارے، 2 Meteorological سیارے، 1 تعلیمی (Educational) سیارہ، 1 ملٹی مشن (Multimission) سیارہ اور 1 DTH سیارہ شامل ہے۔

□□□

پتہ:
H.No. 6-17, Deshmukh Street, Basavakalyan,
Dist. Bidar, Karnataka State, 585327

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

''جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی گھانے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

کاشف غزالی

کمپیوٹر سائنس میں کیریئر

کیریئر کے میدان میں زبردست مقابلہ آرائی کی وجہ سے نوجوان اب تعلیم کی قدیم روایت کو درکنار کرتے ہوئے جدید مضامین پڑھنے میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ان کا ہدف کم وقت میں ایسا کورس کرنا ہے، جس کی روزگار کے میدان میں نہ صرف ڈیمانڈ زیادہ ہو، بلکہ جس میں کچھ جدت بھی ہو۔اگر اس طرح کی کوشش آپ بھی کرنا چاہتے ہیں تو کمپیوٹر سائنس بہتر متبادل ہوسکتا ہے۔آئی ٹی سیکٹر میں روزگار کے بے شمار امکانات موجود ہونے کے سبب گذشتہ کچھ وقت سے دیکھا جارہا ہے کہ طالب علموں کے درمیان کمپیوٹر سے وابستہ مضامین کا مطالعہ کرنے کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئی ٹی سیکٹر میں کمپیوٹر سائنس ماہرین کے لیے ہر روز دروازے کھل رہے ہیں۔گذشتہ کچھ برسوں میں ہندوستان میں بھی اس کا اسکوپ مسلسل بڑھتا ہوا نظر آیا ہے۔

اچھی بات یہ ہے کہ ہندوستانی طالب علم کیریئر کے میدان کے بدلتے ٹرینڈ سے نہ صرف متعارف ہیں، بلکہ اسے قبول بھی کر رہے ہیں۔ ہندوستانی کمپنیوں میں ٹی سی ایس، انفوسس، وپرو، ستیم، ایچ سی ایل اور غیر ملکی کمپنیوں میں آئی بی ایم، مائکروسافٹ وغیرہ اس نئے ٹرینڈ کو فروغ دے رہی ہیں۔تقریباً سالانہ ایک لاکھ 20ہزار طالب علم آئی ٹی سیکٹر سے اس میدان میں ملازمت حاصل کر رہے ہیں۔

کیا ہے کمپیوٹر سیکٹر؟ انجینئر وہ شخص ہوتا ہے، جو سائنس کا استعمال کرکے مسائل کا حل نکالتا ہے۔انجینئرنگ کی کئی شاخوں میں کمپیوٹر سائنس کی اپنی ایک خاص شناخت ہے۔کمپیوٹر سائنس، ہارڈویئر، سافٹ ویئر اور کمپیوٹیشن وغیرہ کی آمیزش ہے۔ترقی پذیر اقتصادی نظام اور تیز ہوتی صنعت کاری کے باعث ہندوستان میں بھی آنے والے وقت میں تمام کام کمپیوٹر کے ذریعہ ہی ہوں گے۔کمپیوٹر سائنس پڑھنے والے طالب علم جانتے ہیں کہ یہ مضمون ہمیں نہ صرف کام کرنے کی سہولت دیتا ہے بلکہ کئی گنا فاسٹ بھی بنا دیتا ہے۔

کمپیوٹر مضمون: سب سے پہلے طالب علم میں اس نئی تکنیک کی بنیاد ڈالنے کے لیے اسے کمپیوٹر فنڈامینٹل پڑھایا جاتا ہے۔ بعد ازاں کمپیوٹر آرگنائزیشن اور اس کے مختلف اندرونی حصوں کی جانکاری دی جاتی ہے۔ جیسے کہ سینٹرل پروسیسنگ یونٹ (سی پی یو)، کنٹرول یونٹ (سی یو) اور رجسٹر وغیرہ۔اس کے تحت ہم یہ بھی سیکھتے ہیں کہ کس طرح سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کمپیوٹر کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں کمپیوٹر آرکی ٹیکچر میں ہم ویکٹر پروسیسنگ، پائپ لائننگ اور میموریز وغیرہ کے مضمون پڑھتے ہیں۔ جو جانکاری آج تک موٹے موٹے رجسٹروں میں بند ہے، اس کے لیے دوسرے ڈاٹا بیس مینجمنٹ سسٹم بھی ہوتے ہیں۔آج اگر یہ مضمون نہ ہوتا تو بڑے بڑے اداروں کو اپنا ڈاٹا سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔

اسی طرح کمپائلر ڈیزائن میں ہم سسٹم سافٹ ویئر کی ڈیزائننگ کرتے ہیں۔دراصل کمپیوٹر صرف مشینی زبان سمجھتا ہے اور کمپائلر ایک دو زبان جاننے والے کی طرح پروگرامنگ لینگویج کو مشینی زبان میں تبدیل کردیتا ہے۔

کمپیوٹر گرافکس میں ہم امیجکس کو نشان زد کرنا سیکھتے ہیں۔جس طرح گاڑی کو چلانے کے لیے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کمپیوٹر کو چلانے کے لیے آپریٹنگ سسٹم کی ضرورت پڑتی ہے۔

آرٹی فیشیل انٹلی جنس ایک ایڈوانس ٹیکنالوجی ہے۔روبوٹکس اسی پر منحصر ہے۔اس کے اندر لسپ زبان پڑھائی جاتی ہے۔

کمپیوٹر نیٹ ورک کے اندر ہم پڑھتے ہیں کہ کس طرح ایک کمپیوٹر دوسرے کمپیوٹر کے ساتھ کام کرسکتا ہے۔اس میں ہم مختلف ماڈلس کے مضامین پڑھتے ہیں۔جیسے او ایس آئی ماڈل، ٹی سی پی/آئی پی ماڈل وغیرہ۔

پرنسپل آف پروگرامنگ لینگویج مضمون میں ہم مختلف پروگرامنگ کی جانکاری حاصل کرتے ہیں۔

انڈسٹریل اکنامکس و پرنسپل آف مینجمنٹ (آئی ای پی ایم) میں ہندوستانی اقتصادیات اور اس کے مختلف پہلوؤں کی جانکاری ملتی ہے۔ علاوہ ازیں بینکنگ نظام کی جانکاری کی وجہ سے بینکنگ سیکٹر اور فائنانشیل انالیسس سیکٹر میں جانے لگے ہیں۔

کرپٹوگرافی اور نیٹ ورک سیکورٹی میں سکھایا جاتا ہے کہ کیسے ہم سسٹم اور نیٹ ورک کی سیکورٹی کرسکتے ہیں۔ فائر وال، ویب سیکورٹی، وائرس ان ٹریڈرس وغیرہ کی جانکاری بھی اسی مضمون میں دی جاتی ہے۔ان تمام مضامین کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ان سبھی کا نچوڑ کسی ایک پروجیکٹ میں جھلکتا ہے۔

اہلیت: کمپیوٹر سائنس کے بی ٹیک کورس میں داخلہ لینے کے لیے طالب علم کے پاس 2+10 میں جغرافیہ، علم کیمیا اور ریاضی مضمون کا ہونا لازمی ہے۔

کمپیوٹر سائنس میں ڈگری لینے کے بعد طالب علم کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری میدانوں میں کمپیوٹر سائنس سے متعلق بہت ساری روزگار کی سمتیں کھل جاتی ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں میں کمپیوٹر انجینئر کی بہت زیادہ ڈیمانڈ ہے۔ اس کے ساتھ بیرونی ممالک میں بھی ہندوستانی کمپیوٹر انجینئروں کو اولیت دی جاتی ہے۔

چند تربیتی ادارے

- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کانپور
- مہارانا پرتاپ انجینئرنگ کالج، کانپور
- بھابھا انجینئرنگ کالج، کانپور
- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور
- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کھڑگ پور
- ڈپارٹمنٹ آف کمپیوٹر سائنس اینڈ انجینئرنگ آئی آئی ٹی، دہلی
- ڈپارٹمنٹ آف کمپیوٹر سائنس اینڈ انجینئرنگ ممبئی
- اینڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی آئی آئی ٹی، مدراس
- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، مدراس
- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، گوہاٹی

□□□

پتہ:
1071, Haveli Anwar Ali, Suiwalan, Chitli Qabar,
Jama Masjid Delhi- 110006

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین اور تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون "تمہید" کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

فاروق احمد درویش پوری

صحافت ایک پرکشش کیریئر

ٹی.وی. جرنلزم ہو یا ریڈیو جرنلزم یا پھر پرنٹ میڈیا، ہر شعبے میں آج طلبہ کے لیے اچھی آمدنی بھی ہے اور محفوظ مستقبل بھی لیکن اس کے لیے ان کی صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ادارے کا انتخاب سوچ سمجھ کر کریں۔ راجدھانی دہلی میں میڈیا اداروں کی بہتات ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے اداروں کی کل تعداد دہلی میں 100 سے زیادہ ہے۔ جہاں بارھویں (2+10) اور گریجویشن کے بعد جرنلزم سے متعلق کئی قسم کے کورس کرائے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں دوسری ریاستوں سے آئے طلبہ کے سامنے کئی متبادل ہوتے ہیں لیکن صحیح طور پر رہنمائی نہ ہونے کے سبب کئی بار وہ اداروں کے انتخاب میں غلطی کر بیٹھتے ہیں جس کے بعد ان کو کفِ افسوس ملنا پڑتا ہے۔ اس لیے طلبہ کو داخلے سے قبل ادارے کے بارے میں مکمل طور پر جانچ پڑتال کر لینا چاہیے۔ میڈیا کورس کرانے والے اداروں میں بہت سے غیر منظور شدہ بھی ہوتے ہیں۔

پہلے جانکاری حاصل کریں: طلبہ کو کسی بھی ادارے میں داخلہ لینے سے قبل یہ ضرور معلوم کر لینا چاہیے کہ وہ ادارہ UGC سے تسلیم شدہ ہے یا نہیں۔ چونکہ یہ طلبہ کے مستقبل کی بات ہے اس لیے انھیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ادارے کے بارے میں مکمل جانکاری حاصل کرنا چاہیے۔ ویسے صحافت کے لیے ماکھن لال چترویدی یونیورسٹی بہترین تسلیم کی جاتی ہے اور جہاں تک اداروں کی فوقیت کی بات ہے تو یہ بتانا کافی مشکل ہے لیکن انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کی شہرت کافی اچھی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے نجی ادارے ہیں جہاں فارغین آج اچھی جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔

زیادہ تر طلبہ اپنے رشتے داروں، دوستوں اور جان پہچان والوں کی مدد سے ہی بڑے شہروں میں آتے ہیں اور ان کے ذریعے ہی اداروں سے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں۔ نجی اداروں میں داخلے کے لیے داخلہ فارم مارچ میں جاری کرنا شروع کر دیا جاتا ہے جو جولائی تک جاری رہتا ہے۔ ایسی حالت میں طلبہ کے پاس کافی وقت رہتا ہے۔ جس سے وہ اچھے اداروں کا انتخاب کر سکتے ہیں اور مطلوبہ جانکاری بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

صحافت ایک ایسا شعبہ ہے جو آغاز سے ہی آپ کو خود کفیل بننے کا موقع فراہم کرتا ہے لیکن یہ آپ کی دماغی قابلیت پر منحصر ہے۔ آغاز آپ فری لانسنگ سے کر سکتے ہیں اس سے کچھ راحت یقیناً ملے گی۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ ٹیوشن کر کے بھی اپنے سرپرستوں کے معاشی بوجھ کو ہلکا کر سکتے ہیں۔

دہلی یونیورسٹی: موجودہ دور میں صحافت کے اندر پہلے کی بہ نسبت کافی تبدیلی آئی ہے اور اب صحافت کے لیے تکنیکی علم کا ہونا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ چونکہ دہلی میڈیا کا قلعہ سمجھا جاتا ہے اسی لیے دہلی میں صحافت کا کورس کرانے والے اداروں کی تعداد دوسرے شہروں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ بارھویں کے امتحان کے بعد سے ہی طلبہ میں میڈیا کے اداروں کے بارے میں جانکاری اکٹھی کرنے کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان طلبہ کی پہلی پسند دہلی یونیورسٹی ہوتی ہے۔ یہاں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورس کے علاوہ سرٹیفکیٹ کورس بھی کروایا جاتا ہے۔ اس کورس میں داخلے کے لیے ہر سال داخلہ امتحان کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے کم از کم 55 فیصد نمبروں سے 2+10 پاس ہونا نہایت ضروری ہے یہاں جون میں فارم جاری کیے جاتے ہیں اور جولائی میں ٹیسٹ ہوتے ہیں۔

ٹیسٹ دو حصوں میں لیے جاتے ہیں۔ پہلا تحریری مضمون اور دوسرا کامیاب طلبہ کا انٹرویو۔ صحافت کے کورس دہلی یونیورسٹی کے تحت چلنے والے کئی کالجوں میں کرائے جاتے ہیں لیکن ایک ہی سنٹرل فارم ملتا ہے اور امتحان میں حاصل شدہ نمبروں کی بنیاد پر ہی طلبہ کو دہلی یونیورسٹی کے الگ الگ کالجوں میں داخلہ ملتا ہے۔

کورس: 1. تین سالہ بی.اے (آنرس)، 2. دو سالہ PG ڈپلوما کورس، 3. ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس

جامعہ ملیہ اسلامیہ: صحافت کے شعبے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کا ایک معروف ادارہ ہے۔ یہاں بھی داخلے کے لیے ہر سال امتحان لیا جاتا ہے اور عموماً مئی کے دوسرے ہفتے میں فارم کی تقسیم شروع کر دی جاتی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کی طرح یہاں بھی داخلہ امتحان کے دو حصے ہیں۔ تحریری 2+10 کامیاب طلبہ کا انٹرویو۔ طلبہ کا انتخاب میرٹ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے میں کم از کم 45 فیصد نمبروں کا ہونا ضروری ہے۔ جبکہ آنرس کے لیے 50 فیصد۔ یہاں ہاسٹل کی بھی سہولت ہے۔ جامعہ کا اپنا Placement Cell بھی ہے جہاں طلبہ درخواست دے کر اچھی جگہوں پر نوکری کر سکتے ہیں۔

کورس: 1. سہ سالہ (آنرس): ماس میڈیا اینڈ کریٹیو رائٹنگ، 2. ایک سالہ

PG ڈپلوما کورس، 3. ایک سالہ PG ڈپلوما کریٹیو رائٹنگ فار میڈیا، 4. (News Reading, Anchoring, جرنلزم TV Reprinting)

جامعہ ملیہ کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہاں ٹی.وی. صحافت کا کورس اردو، ہندی اور انگریزی تین زبانوں میں دستیاب ہے۔

اندر پرستھ یونیورسٹی: دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے بعد گرو گوبند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی کا نمبر آتا ہے۔ یہاں مارچ سے ہی فارم کی تقسیم شروع ہوجاتی ہے۔ یہاں داخلے کے لیے تحریری امتحان کی بنیاد پر میرٹ لسٹ تیار کی جاتی ہے۔ سوالات Multiple Choice پر مبنی ہوتے ہیں۔

طلبہ کی سہولت کے لیے ایڈوانس لیب کا انتظام کیا گیا ہے جس میں PCR Lab, Print Media Lab, Cyber Media Lab اور Video اور Audio Recording, Tutorial Specialisation Recording کی جدید سہولت دستیاب ہے۔ اس ادارے میں پروڈکشن کے کاموں کے لیے اسٹوڈیو بھی موجود ہے۔ ساتھ ہی ہاسٹل کی سہولت بھی دستیاب ہے۔

کورس: 1. Master of Mass Media (2 Yrs.)، 2. Post Graduate Diploma In Electronic Media (One Yr.)، 3. Certificate Course in Video Production (3 Months).

واضح ہو کہ ان مذکورہ یونیورسٹیوں میں کورس سے متعلق تمام جانکاری ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔ لہٰذا تفصیلی معلومات کے لیے ان یونیورسٹیوں کے ویب سائٹ کو لاگ آن کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کریں۔

صحافت کے کورسیز کے لیے کچھ اہم اداروں کے ویب سائٹ

- ☆ Jamia Millia Islamia, New Delhi www.jmi.nic.in
- ☆ Delhi University, Delhi www.du.ac.in
- ☆ Bhartiya Vidya Bhavan, KG Marg, New Delhi. www.bvbdelhi.org
- ☆ Amity School of Communication, Noida, UP www.amity.edu
- ☆ Youngman Christian Association, Delhi www.newdelhiymca.org
- ☆ Pioneer Media School, New Delhi www.pioneermediaschool.com
- ☆ Sri Aurobindo Institute of Mass Communication, New Delhi www.saimc.com
- ☆ Apeejay Institute of Mass Communication, New Delhi www.apeejay.edu
- ☆ Pune University, Pune www.unipune,emet.in
- ☆ Banaras Hindu University, Varanasi www.bhu.ac.in
- ☆ Calcutta University, Kolkata www.caluniv.ac.in

□□□

پتہ:
82, Hospital Road, Kamarhatty Sharif,
Kolkata-700058

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی وسیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت: -/33 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد افضل خاں

علقمہ شبلی سے بات چیت

جناب علقمہ شبلی نے پورے مغربی بنگال کو اپنے ادبی کاموں سے متاثر کیا ہے۔ 1991 میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین رہے۔ ڈاکٹر مظہر کبریا کو آپ کی حیات اور شاعری پر پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری بہار یونیورسٹی سے تفویض ہوئی۔ لٹریری سب کمیٹی، مسلم انسٹی ٹیوٹ نے 25 فروری 2007 کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا آپ گیارہ ادبی کتابوں اور بیس سے زیادہ درسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پچھلے دنوں راقم الحروف نے ان سے جو گفتگو کی وہ نذر قارئین ہے۔

سوال: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

جواب: میری پیدائش یکم نومبر 1930 کو ریاست بہار کے ایک گاؤں میر غیاث چک ضلع نالندہ میں ہوئی۔

سوال: اپنی تعلیمی زندگی کے بارے میں براہ کرم تفصیل سے بتائیں۔

جواب: ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ میرے والد مولانا عبدالجبار جید عالم تھے۔ میرے بڑے ابا حکیم عبدالعزیز اور خالو جان مولانا نعیم الدین بھی علم و ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھی بزرگوں کی زیر نگرانی ہوئی۔ والد محترم اور خالو جان کے ساتھ کچھ دنوں الہٰ آباد میں بھی قیام رہا۔ پھر جب والد محترم کا دربھنگہ کے دارالعلوم مشرقیہ حمیدیہ میں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے تقرر ہوا تو میں بھی ان کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔ 1945 میں بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ سے مولوی اور 1948 میں مسلم اسکول لہریا سرائے سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد سی ایم کالج دربھنگہ میں داخلہ ہوا اور 1952 میں بہار یونیورسٹی سے بی کام کی ڈگری لی۔ 1959 میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی ٹی کی سند لی اور 1963 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کا پرائیویٹ امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔ مجھے والد محترم کے علاوہ دوسرے اساتذہ کی شفقت بھی حاصل رہی۔ ان بزرگوں نے دل میں وہ ذوق مطالعہ پیدا کر دیا جس نے ایک نئی دنیا کی سیر کا حوصلہ دیا۔

سوال: آپ کی شاعری کا آغاز کب ہوا۔ اس زمانے کی علمی و ادبی حالات پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: میری شاعری کا باضابطہ آغاز 1948 میں ہوا۔ ملک کی آزادی سے پہلے لوگ آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے جن میں اہل قلم بھی تھے۔ اس لیے نظم و نثر دونوں میں حب الوطنی کی لے تیز تھی اور سامراجیت اور استعماریت کے خلاف احتجاجی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ آزادی کے بعد صورت حال بدل گئی اور ادیبوں اور شاعروں میں وہ پہلا سا جوش و خروش نہیں رہا۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور انتقال آبادی کی وجہ سے ایک طرح کی شکست خوردگی کے احساس نے سر اٹھایا۔ شعر و ادب میں خطیبانہ لہجے کی جگہ رمزیت و اشاریت نے لے لی۔ اسی وجہ سے غزلوں کی طرف توجہ زیادہ ہوئی۔

سوال: آپ نے کہاں کہاں ملازمت کی اور آخر میں کہاں سے سبکدوش ہوئے؟

جواب: میں 1952 میں تلاش معاش میں کلکتہ پہنچا اور ایم ایل جبلی انسٹی ٹیوشن میں تدریسی خدمت پر مامور ہو گیا۔ یہاں چند سال ملازمت کرنے کے بعد تقریباً پانچ سال تک کلکتہ میونسپل کارپوریشن اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز رہا۔ 1965 سے 1990 تک ہندوستان کی معروف درس گاہ مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ سے بحیثیت استاذ وابستہ رہا۔ وہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تقریباً تین سال تک گیسٹ لیکچرار رہا۔

سوال: صدام حسین کی پھانسی پر آپ نے احمد سعید ملیح آبادی صاحب کی گذارش پر دو تین گھنٹوں میں ایک تاثر انگیز نظم لکھی جو آپ کی زود گوئی کی عکاس ہے۔

جواب: ملکی اور بین الاقوامی اہم واقعات سے ہر شاعر بقدر ظرف متاثر ہوتا ہے اور یہی تاثر اس کی شاعری میں طرح طرح سے جلوہ نما ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تاثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ احساس کو اظہار کی منزل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ صدام حسین کی پھانسی کا حادثہ اسی طرح کا ایک دل دہلا دینے والا واقعہ تھا جس نے مجھ سے نظم لکھوالی۔ یہ مخصوص کیفیت ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ اس کیفیت سے شاعر ہمیشہ دوچار ہو۔

سوال: آپ کی شعری اور نثری تخلیقات کے کتنے مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں؟

جواب: میرے شعری مجموعے ہیں ''حرف وصوت'' (1975)، ''بے

چہرہ لیے" (1975)، "تارے زمین کے" (1976)، "پھول آنگن کے" (1979)، "خواب خواب زندگی" (1990)، "زادِ سفر" (1990)، "دھوپ دھوپ سفر" (2003)، "صلوا علیہ وآلہٖ" (2004) اور "چہار آئینہ" (2007) "دیارِ حرم میں" اور "بوستاں کی کہانیاں" نثری کتابیں ہیں۔

سوال: آپ کی کن کتابوں پر انعامات و اعزازات ملے ہیں؟

جواب: بے چہرہ لیے" کو اتر پردیش اور بہار اردو اکادمی انعامات، "تارے زمین کے" کو بہار اردو اکادمی انعام، "پھول آنگن کے" کو اتر پردیش اردو اکادمی انعام، "خواب خواب زندگی" کو مغربی بنگال اور بہار اردو اکادمی انعامات، "دیارِ حرم میں" کو اتر پردیش اور مغربی بنگال اردو اکادمی انعامات اور "صلوا علیہ وآلہٖ" کو بہار اردو اکادمی انعام مل چکے ہیں۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے 1997 میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ سے اور حمد و نعت اکادمی، دہلی نے 2007 میں حضرت حسان ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ بھارتیہ پریشد کولکاتا کا رجت جینتی سمان 1999 میں ملا۔

سوال: آپ مرزا غالب اور میر تقی میر میں کس کو پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

جواب: میں میر اور غالب دونوں کو پسند کرتا ہوں۔ میر میرے روح و دل کو سرشار کرتے ہیں۔ غالب میرے ذہن و دماغ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ان کے اشعار گنجینۂ معنی کا طلسم آشکارا کرتے ہیں۔ ان دونوں کی شاعری ہمارا ادبی و تہذیبی سرمایہ ہے۔

سوال: آزاد نظم جدید شاعری کی دین ہے۔ کیا اس صنف سخن کو آپ سہولت پسندی نہیں مانتے؟

جواب: کوئی صنف سخن ہو، اسے سہل پسندی راس نہیں آتی۔ جو شعرا زبان کی لطافتوں اور شاعری کی نزاکتوں کے رمز آشنا ہیں، انھوں نے اس صنف کو بھی کامیابی سے برتا ہے۔

سوال: نئی نسل کے شعرا اور ادبا کو آپ کوئی مشورہ دینا چاہیں گے؟ شعر و ادب کے فروغ میں نئی نسل کے قلمکار کہاں تک معاون ثابت ہو رہے ہیں؟

جواب: نئی نسل کے شعرا اور ادبا اگر شعر و ادب میں اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں تو انھیں مشاہدہ و مطالعہ اور مشق و ریاضت کو اپنا رہنما بنانا چاہیے۔ مشاہدہ و مطالعہ سے نظر میں وسعت اور فہم و ادراک میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور مشق و ریاضت سے فن میں پختگی آتی ہے۔ روایت کی مثبت قدروں پر بھی نگاہ ہونی چاہیے اور تازہ ہوا کے جھونکوں کے لیے بھی دل و دماغ کے دریچوں کو کھلا رکھنا چاہیے۔

سوال: آپ بچوں کے لیے بھی مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا تجربہ کیا ہے؟

جواب: اس سلسلے میں میرا تجربہ کچھ خوشگوار اور حوصلہ افزا نہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی چیزوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کے لیے شعری و ادبی محاسن پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں، محض تک بندی سے کام چل جاتا ہے۔ حالانکہ ادب اطفال کے لیے ادبی و شعری محاسن کے علاوہ بچوں کی نفسیات اور ان کے مزاج سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے۔ اب صورت حال میں کچھ تبدیلی آئی ہے اور ادب اطفال کو اہمیت دی جا رہی ہے۔

سوال: رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ان تحریکوں یا رجحانوں کے ادب پر کیا اثرات پڑے؟

جواب: زندگی کی طرح ادب بھی جامد نہیں۔ تغیر و تبدل اس کی سرشت میں داخل ہیں۔ ادب کی مثال ایک رواں دواں دریا کی ہے جس کا پانی ساکن نہیں رہتا۔ ہمیشہ اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ اسی طرح ادب میں کسی تحریک یا رجحان کو دوام نہیں۔

□□□

پتہ:
76/4, Srinath Pural Lane,
Howrah-711101 (W.B.)

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی و ادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت و مقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس و تدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت-/66 روپے

صلاح الدین احمد

(ہماری مطبوعات سے)

محمد علی ردولوی
اردو کا اوّلین فطرت نگار

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر ہماری زبان میں دو ایسے لکھنے والے نمودار ہوئے جنھوں نے اپنے بیان کی شگفتگی او راظہار کی سلاست اور ادائے مطالب کی بے مثال صلاحیتوں سے اردو کی حدود کو حدِ نظر تک پھیلا دیا اور عوام کو پہلی بار نہ صرف اعلیٰ درجے کی نثر سے لطف اندوز ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، بلکہ اس رشتے کی تخلیق کی جو مصنف کے قلم کی لرزش کو جمہور کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کر کے ادب کی ایک لازوال خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں منفرد تھے اور اگرچہ بنیادی طور پر ان میں ایک یک جہتی پائی جاتی تھی، لیکن دونوں اسالیب نگارش اپنی علاحدہ علاحدہ امتیازی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ، بلکہ دونوں کے کام کے میدان بھی جدا جدا تھے۔ ایک اگر خارجی دنیا کے میدانِ ناپیدا کنار کا شہسوار تھا تو دوسرا دریائے دل کی گہرائیوں کا غوطہ زن۔ ایک اگر ابلق صحافت پہ سوار، جادۂ ادب کی نئی نئی منزلیں طے کر رہا تھا تو دوسرا مجلسِ احباب میں تکیہ لگائے اپنی موہنی کے عمل سے دلوں کے قلعے تسخیر کیے چلا جا رہا تھا۔ اتفاق زمانہ دیکھیے کہ ایک نے کم وبیش چالیس برس ہوئے اپنی بساطِ عمل تہہ کر کے رکھ دی اور دوسرا جس آہستگی اور خاموشی سے اس میں داخل ہوا تھا، آج بھی اس کے پُر بہار راستوں پر اسی طرح دبے پاؤں چل رہا ہے اور اپنی اس سیرِ صبح گاہی میں کبھی کبھی ہمیں بھی شریک کر لیتا ہے۔ ناظرین! ان میں سے ایک کا نام عبدالقادر اور دوسرے کا نام محمد علی ہے۔ وہ دونوں ہم سن ہیں اور خدا کرے کہ ایک عرصۂ دراز تک اس زندگی میں ہم سن ہی رہیں۔

اردو ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم عبدالقادر کی ساحرانہ سلاست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سہلِ ممتنع لکھتے ہیں اور اپنی آسان نگاری میں بڑی بڑی نازک باتیں نہایت صفائی اور صحت کے ساتھ سامنے لے آتے ہیں۔ اسی طرح محمد علی جب اپنے عروج پر پہنچتے ہیں تو نو انصیبن یا امامن مہری کی زبان میں نفسیات انسانی کی وہ گتھیاں سلجھا کے رکھ دیتے ہیں کہ ناظر ششدر رہ جاتا ہے۔ مطالب کے لحاظ سے دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عبدالقادر کا موضوع بیشتر خارجی ہوتا ہے اور وہ خارج سے داخل کی طرف بالعموم رجوع نہیں کرتے، بلکہ اپنی بیرونی دنیا کے مسائل و مناظر ہی میں کھو جاتے ہیں۔ اس کے خلاف محمد علی اگرچہ اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد بیشتر محسوسات خارجی ہی پر رکھتے ہیں، اور وہ جو کچھ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی کچھ عین مین ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اپنے موضوع کی طرف ان کی پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناظر کا ہاتھ پکڑے ایک نامحسوس انداز میں اسے اس دنیائے سنگ وخشت سے نکال کر، اس عالم خیال میں لے کر اتر جاتے ہیں، جن کی رنگینی، حقیقت کی عُریاں سادگی سے آنکھیں ملاتی ہے اور محجوب نہیں ہوتی۔ محمد علی حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتا ہے، اور از بسکہ وہ اپنے مشاہدے میں صداقت سے کبھی آنکھیں نہیں چراتا، اور اپنے بیان میں تخیل کی باگیں کبھی ڈھیلی نہیں چھوڑتا، او راس لیے اس کا پیش کردہ امتزاج فنی ادب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے اور اس معیار پر بہت کم فنکاروں کی تخلیقات پوری اترتی ہیں۔ عبدالقادر سے میں نے اس کا مقابلہ محض اس کی سلاستِ زبان اور لطافتِ بیان کے پیش نظر کیا ہے ورنہ یہ مخفی نہیں کہ دونوں کے میدان اور میلان بالکل مختلف ہیں۔ عبدالقادر افادی ادب کے بہت بڑے معمار ہیں اور انھوں نے بیانیہ نثر کا ایک بے نظیر اور ترقی پذیر اسلوب ہماری زبان کو بخشا ہے۔ وہ فنی ادب سے چنداں دل چسپی نہیں رکھتے اور ان کا موضوع انسان نہیں بلکہ وہ عالم ہست و بود ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انھیں فنی ادب اور اس کی مقتضیات سے چنداں واسطہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے خلاف محمد علی کا موضوع بیشتر صورتوں میں خود انسان اور اس کا وہ جہان خیال ہے جس میں وہ اس مختصر زندگی کے چند لمحے بسر کرتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی تخلیقات بیشتر ان کی تخیل کی مرہون ہوتی

"کلیات چودھری محمد علی ردولوی" سے ماخوذ، ترتیب و تدوین: مسعود الحق / صفحات 344، قیمت: -/172 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ہیں یا وہ ان کی تعمیر کا مسالہ سراسر اس دنیائے داخلی سے حاصل کرتے ہیں جو ان کے اپنے ذہن رسا میں آباد ہے۔ نہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر چہ محمد علی اپنے فکر کو زیادہ تر افسانے کا لباس پہناتے ہیں اور اپنے افسانوں میں نفسیات انسانی کے بعض نازک ترین پہلوؤں کو بھی بے نقاب کر جاتے ہیں لیکن اس میں قطعاً کلام نہیں کہ وہ بنیادی طور پر مفکر نہیں بلکہ خالص افسانہ نگار ہیں۔ وہ آپ کو اس لیے کہانی نہیں سناتے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنی فکر کی کسی کاوش یا اپنے تخیل کی کسی گرفت کا اظہار چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ اس لیے سناتے ہیں کہ انھیں اسے سنائے بغیر چارہ نہیں اور اگر وہ نہ سنائیں تو شاید بیمار ہو جائیں۔ وہ نہ تو نذیر احمد کی طرح کسی معاشرتی اصلاح کے علمبردار ہیں، نہ پریم چند کی مانند سماج کے بعض انوکھے تقاضوں کے ناز بردار اور نہ انھیں ہمارے ترقی پسند دوستوں کی طرح جسم فروش یا مزدور طبقے کے مسائل کا کوئی افسانوی حل تلاش کرنے کی مجبوری ہے۔ میری ناچیز رائے میں وہ زندگی کے محض ایک خوش نظر تماشائی ہیں کہ اس کے پُر رونق بازار میں سے اس کی رنگارنگ کیفیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے خراماں خراماں چلے جارہے ہیں اور جہاں کہیں ان کی نگاہ کسی دلچسپ چیز پر پڑتی ہے وہ ایک لمحہ کے لیے رک کر اسے نظر بھر کر دیکھ لیتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نگاہ کیوں اور کہاں رکتی ہے اور اس انتخاب کے عناصر کیا کیا ہوتے ہیں۔ ان عناصر کا ایک ہلکا سا جائزہ ہم آگے چل کر لیں گے۔ یہاں مجھے صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ محمد علی کسی مقصد یا نظریے کی تبلیغ کے لیے کوئی کہانی بنا کر ہمیں نہیں سناتا، نہ اپنے کسی تخیل پارے کو پھیلا کر افسانے کے لباس میں پیش کرتا ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک زیرک طالب علم ہے اور اس کے مطالعے میں جو غیر معمولی یا لطیف یا مضحکہ انگیز صورتیں اس کے سامنے آتی ہیں یا اپنے طویل مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر وہ زندگی کی مختلف کیفیتوں سے جن نتائج کا استخراج کرتا ہے ان صورتوں اور نتائج کو وہ ایک نہایت لطیف و بلیغ پیرائے میں کہ سلاست و رنگینی سے بہ یک وقت متصف ہوتا ہے ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے اور پھر اس بات سے قطعاً بے نیاز ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی پیش کش سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک خالص آرٹسٹ ہے، اور اسے اپنی تخلیقات سے یہیں تک سروکار ہے کہ وہ اس نہاں خانۂ محسوسات سے نکل کر لباس اظہار پہن لیں۔ رہا یہ کہ ہم ان کے جمال جہاں آرا سے کیا اثر قبول کرتے ہیں، اس سے اسے کوئی غرض نہیں۔ اس کا یہ انداز نظر اپنے موضوع تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس کے ذریعے اظہار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی بلکہ خود سرانہ رویہ روا رکھتا ہے۔ وہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کا بھی قائل نہیں اور وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو عین وہی الفاظ دینے پر اصرار کرتا ہے، جن میں وہ اس پر وارد ہوئی اور اگر آپ قبول عام یا رواج ادب یا خوف محتسب کے پیش نظر اسے کسی متبادل لفظ یا ترکیب کی طرف متوجہ کریں، تو وہ اسے سو میں سے نوے صورتوں میں رد کردے گا اس سلسلے میں مجھ سے چودھری صاحب کی متعدد جھڑپیں ہوئیں اور اگر چہ انھوں نے میرے ادارتی اختیارات سے مجبور ہو کر اکثر میری بات مان لی، لیکن کس طرح مانی، یہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ دو ایک موقعوں پر البتہ وہ میری ترمیم سے خوش بھی ہوئے لیکن یہ مواقع بہت شاذ تھے۔ تو اس سے ان کے خالص فنی زاویۂ نگاہ کا پتہ چلتا ہے۔ فن کار اپنی غیر مرئی محسوسات کو لباسِ اظہار پہناتا ہے۔ اولاً اس لیے کہ وہ اس کے لیے اپنے آپ سے مجبور ہے اور ثانیاً اس لیے کہ وہ قدرت کی طرف سے تقسیم مسرت کی خدمت پر مامور ہے مسرت کی تقسیم کا اندازہ وہ خود مقرر کرتا ہے اور اس بارے میں اسے کسی تعلیم یا تلقین کی ضرورت نہیں۔ فن کا منزلِ اصلی یہی ہے، اس سے آگے جو راستہ جاتا ہے وہ تصنع، آورد، مصلحت، اصلاح، تبلیغ اور پروپیگنڈے کی پستیوں میں اتر جاتا ہے۔

محمد علی کا میدانِ تگ و تاز اودھ کی قصباتی فضا اور اس کی نرم رو زندگی ہے۔ اس فضا میں اس نے اپنی ذاتی زندگی کے کم و بیش ستر برس گزارے ہیں۔ اور یہ ایک فطری تقاضا تھا کہ وہ اپنے فنی کارناموں میں اسی فضا کا عکس پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے فن کار گزرے ہیں، سب نے ایسا ہی کیا ہے اور جب تک ادب میں خالص فن کی قدریں باقی ہیں ایسے ہی فن پاروں کو عظمت و عزت کے وہ مقامات حاصل رہیں گے، جو فطری طور پر ان کا حق ہیں۔ آپ میں سے جن حضرات نے والٹر سکاٹ کا ''آئی ون ہو'' پڑھا ہے یا ایملی برانٹی کی ''ودرنگ ہائٹس'' یا گورکی کی ''ایک خزاں کی رات''، یا موپساں کی ''سکیپ گوٹ'' یا کالی داس کی ''شکنتلا'' کا مطالعہ کیا ہے یا شرت چندر کا ''انا پورنا کا مندر'' دیکھا ہے، ان سے میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے مطالعے کے استغراق میں کیا انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی طلسمی جھولے میں بیٹھ کر خود اس دنیا میں پہنچ گئے ہیں، جس دنیا میں ان کا داستان گو سانس لے رہا ہے۔ وادئ نربدا کے کسی لہلہاتے ہوئے جنگل کی معطر کچھائیں ہوں، یا شمالی برطانیہ کے ویران پہاڑی قلعوں کی سنگین اور کپکپاتی ہوئی نیم روشن خلوتیں، ہمارے حواس ظاہری نے دونوں میں سے کسی ایک کو محسوس نہیں کیا لیکن فن کار کی طلسمی چھڑی کی ایک ہی جنبش سے ہم چشم زدن میں ان فضاؤں میں جا پہنچے ہیں اور ان رومانوں اور کہانیوں کے کرداروں کے دل کی دھڑکنیں ہمارے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور ہیرو کی آنکھوں کی چمک اور ہیروئن کے سانس کی خوشبو ہمارے کلبۂ ذہن اور مشامِ جان میں سرایت کر جاتی ہے اور ہم ان کے رنج و راحت کے شریک اور ان کے حاضر غائب کے رفیق بن جاتے

ہیں۔

اس کے خلاف آپ نے بیسیوں ایسے افسانے ملاحظہ کیے ہوں گے اور درجنوں ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جو آپ کو بس یونہی چھوتی ہوئی سی گزر جاتی ہیں اور آپ کے دل، یا دماغ پر اپنا کوئی نقش دیرپا نہیں چھوڑتیں۔ افسانے کی ان مختلف صورتوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کا خالق اپنی تخلیق کے عناصر میں کسی مقصدِ خاص کو شامل نہیں کرتا۔ وہ جس طرح کی زندگی کو دیکھتا ہے جس طرح اسے محسوس کرتا ہے، عین اسی طرح اسے اپنے تصور کے خلوص اور اظہار کی شدت کی تائید سے ہم تک منتقل کر دیتا ہے اور اس عملِ انتقال میں وہ اہلیت کم یاب جو اسے ارزانی ہوئی ہے، اور جسے ہم فن کا نام دیتے ہیں، بروئے کار آتی ہے اور اظہار محض کو حسنِ اظہار سے آراستہ کرتی اور سخنِ سادہ کو گرمیِ گفتار عطا کرتی ہوئی اپنی منزل کو جالیتی ہے۔ دوسری قسم کی تصانیف ان صاحبوں سے نسبت رکھتی ہیں، جو فن کار نہیں بلکہ محض کاری گر ہوتے ہیں اور وہ ایک دیے ہوئے نمونے پر گاہک کے حسب منشا اس کے کام کی چیز تیار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مصنوعات سے زندگی کے ادنیٰ اور معمولی کام تو لیے جاسکتے ہیں لیکن وہ شے لطیف جسے اہتزازِ نفس اور بالیدگیِ روح کا منبع کہیے اور جو سوز و ساز کی ہمہ رنگ کیفیتوں سے ہم آغوش ہوتی ہے، ان کاریگروں کے تصور سے بھی ماورئی رہتی ہے اور عنقا کی طرح ان کی پست بستیوں پر اپنا سایہ بھی نہیں ڈالتی۔

اردو کے فن کار ادیبوں میں جو مادرِ فطرت کے آغوش میں پلے اور بڑھے ہیں اور جن کی سحر بیانی اسی کے سہانے بولوں کی مرہون اور جن کی فکر و دانش اسی کی بتائی پہیلیوں کی ممنون ہے۔ محمد علی ایک یکتا اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے یکتا کا لفظ پورے ارادے اور ذمے داری سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مطالعے کی حدود سے کبھی باہر نہیں جاتے۔ وہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں اور ان کا کوئی قصہ کسی اڑتے ہوئے جذبے یا کسی ابلتی ہوئی تحریک سے جنم نہیں لیتا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے کسی خیال افروز مشاہدے یا اضطراب انگیز سے جنم نہیں لیتا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے کسی خیال افروز مشاہدے یا اضطراب انگیز مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اس حیثیت سے بھی ایک امتیاز خاص کے مالک ہیں کہ وہ من و تو کی حدود کو ایک بے مثال شان بے تکلفی سے عبور کر کے اپنے ناظر سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں گویا وہ خود قصہ نہیں لکھ رہے بلکہ وہ اور ان کا پڑھنے والا دونوں، ہاتھ میں ہاتھ دیے، اس قصے میں سے روحانی طور پر گزر رہے ہیں۔ یہ کیفیت ہمارے یہاں انھی سے خاص ہے۔ میری اس گزارش سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زندگی کے محض ایک چابک دست عکاس ہیں، ہرگز نہیں۔ زندگی کی تصویر کھینچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس تصویر میں بڑے لطیف اور نادر رنگ بھی بھرتے جاتے ہیں اور یہ رنگ اپنی شوخی، ان کی شوخیِ طبع اور سرخی، ان کے خونِ دل سے مستعار لیتے ہیں۔ زندگی کا ہر کامیاب مصور ایک دیدۂ بینا کے ساتھ ایک چشمِ باطن سے بھی بہرہ یاب ہوتا ہے۔ محمد علی کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ارزانی ہوئی ہے وہ ایک نادرہ کار مصورِ محسوسات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک ماہر نفسیات بھی ہیں اور ان کے بیشتر افسانے علم النفس، خصوصاً اس کے جنسی پہلو کے بیش بہا مطالعات اور دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ نہایت اخلاص سے کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر بھی نمایاں کرتے ہیں اور اس کی پہیلیوں کا حل بھی بتاتے ہیں۔ حقیقتاً وہ تصویر کشی کے لیے بھی زندگی کا وہی پہلو چنتے ہیں جس میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہو۔ اس لیے ان کی تصویریں سپاٹ نہیں ہوتیں بلکہ وہ ناظر کے حواس پر چھا جاتی ہیں اور بیشتر اوقات اس پر حملہ بھی کر بیٹھتی ہیں اور اس کے پندار کو چھلنی چھلنی کر دیتی ہیں۔ مثلاً ان کے ناظرین میں کوئی ادھیڑ عمر کی صحت مند بیوہ ہو جب ان کے افسانے ''دھوکا'' میں ناظمہ اور اس کے اندر والے کا مکالمہ پڑھتی ہے تو بجز اس کے کہ وہ اپنا منہ نوچ لے یا سر پیٹ لے اور کیا کر سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہی کہ کہانی کو دیا سلائی دکھا دے اور جائے نماز بچھا کر ستر نفلوں کی نیت باندھ لے۔ اب آپ مضطرب ہوں گے کہ میں اس مکالمے کی ایک جھلک آپ کو یہیں دکھا دوں اس لیے پہلے ہی سے تعمیل ارشاد کیے دیتا ہوں۔

صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمہ بیگم کے دل کے اندر کوئی ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

''سنیے صاحب، میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں۔ اگر آپ کو اس میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس کو دور دفان کیجیے۔ اگر اچھی معلوم ہوتی ہو تو سنتے جایئے کہ ناظمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا۔ ان کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا اور ان کی حِس باطن نے عقل و خواہش سے کیا کچھ کہلایا:

اندر والا: سنو بی بی ناجو! تم اور صغیر (یہ ان کے ہمدرد کا نام ہے) پردے سے ملے، گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو، اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کہ نہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو چچی کہتا ہے۔

اندر والا: یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کرتی ہو۔

ناجو: تو اس میں کیا حرج ہے، اگر میرے خیال دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا: تم جتنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو: ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندر والا: پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں۔ ہنسی تو پھنسی پرانی مثل۔

ناجو: ہوا کرے مثل اپنے بڑھے پر سے ہزاروں جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اندر والا: بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو، اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو: میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے۔ اس کی بیوی تو ویسی ہی پٹھیا ہے۔

اندر والا: مگر وہ صورت میں تو تمھارے تلووں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو: یہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا: اور جو ہو جائے۔

ناجو: ہو جائے تو ہماری جوتی سے، لترے سے، پاپوش سے۔ مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا: یہ دیکھو کھلا نا۔ یہی تو میں کہتا تھا۔

ناجو: ہوگا بھئی۔ ہم کیا کریں نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں، کوئی نہ کوئی خیال آئے گا ضرور۔

اندر والا: اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی تو جاتی ہو۔

ناجو: ہاں سو جاتے ہیں، تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں۔ ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کرلے گا۔

اندر والا: ہاں۔ اب ٹھیک راستے پر آگئیں۔ یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بیجا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کو جی ترس گیا۔

اور پھر اس کے بعد کہانی جس موڑ سے گزرتی ہے ہمیں اس وقت اس سے غرض نہیں لیکن لگے ہاتھوں اس افراتفری کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیے جو صغیر کے بامراد ہونے کے بعد اس کے دل میں اسی اندر والے نے مچائی۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یونہی کبھی دیکھ لی ہوگی۔ اب بامراد دیکھا۔ وہ صورت شکل، وہ رعب حسن وہ تناسب اعضا، وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی۔ آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا۔ (واضح رہے کہ ناظمہ بتیس برس کے پیٹے میں تھی اور صغیر ان سے آٹھ برس چھوٹا) البتہ دو چار برس کے بعد کچھ کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر: بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اور کسی بات میں بڑھاپا تو نہیں ہے۔

اندر والا: بڑھاپا تو نہیں ہے۔ مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر: اجی محبت اصل چیز ہے، پنڈا اونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا: محبت الگ چیز ہے، جوانی الگ ہے، ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو۔

صغیر: جوانی کے دن کی چیز ہے، محبت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا: ہے تو ہمیشہ کی، مگر جوانی میں مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر: محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا: اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسی بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے۔ بیسنی بیسنی ہی ہے مگر کیا روز روز پلاؤ کھا کر کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا؟ وہ بیسنی والی سنداہٹ تو تمھاری پہلی بی بی ہی میں ہے۔

صغیر: میں نے کہہ دیا ہے کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو ہماری اس بی بی کا نام ہمارے سامنے نہ آوے۔

اندر والا: ارے میاں تمھاری بی بی سے ہم سے مطلب! ہم تو جوان عورت کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ تمھاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمھاری بیوی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہنچ آسان ہے اور کوئی بات نہیں۔

صغیر: یار یہ تو ہے، مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائے گی اور مجھ کو چین نصیب نہ ہوگا۔

اندر والا: خیر چھاتی واتی تو کیا پھٹے گی، مگر ہے بڑی سخت بات، اور غضب تو یہ ہے کہ بغیر اس کے بھی پیاس بجھتی معلوم نہیں ہوتی۔

صغیر: یار تو پھر کیا کریں۔

اندر والا: کرو گے کیا، ملاپ کرو۔

صغیر: اور ناظمہ کو کیا کریں...اس سے چار آنکھیں کیسے کریں گے۔

اندر والا: سب کچھ ہو جائے گا۔ سنو میاں! ہم ہوں، کہ تم ہو، کہ ناظمہ ہوں، سب ٹھہرے حکم کے بندے حس باطن کے۔ وہاں سے جو ارشاد ہوگا وہ کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کون سے ایسے خوب صورت تھے، کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ جائیں۔

جس باطن نے کہا۔ ناظمہ! منصرم صاحب مرحوم کی صحبت میں تم اپنے ہم سن کو ترس گئیں۔ لہٰذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صفیر کے ساتھ کرلو۔ ناظمہ نے کرلیا۔ اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو بھی نہ چھوڑنا۔ مگر اپنی کم سن بی بی سے ملاپ کرلو۔ بندگی، بے چارگی، تمھارا بس ہی کیا ہے۔''

بعد کے قصے سے ہمیں مطلب نہیں، لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا، فن کار کی اپنے موضوع پر گرفت کیسی کڑی ہے، اور وہ ناظر کی توجہ کو نقطۂ مطلوب پر مرکوز رکھنے میں کیسی عظیم الشان کامیابی حاصل کرتا ہے۔ مضمون پر ایسی ماہرانہ گرفت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ آپ یہ بھی محسوس فرمائیں گے کہ وہ ادائے مطالب کے لیے کم از کم الفاظ استعمال کرتا ہے، لیکن ہر لفظ معنی کی بارود سے بھرپور ہوتا ہے اور جس طرح اور جس مقام پر اسے صَرف ہونا ہے، وہ اس سے خطا نہیں کرتا۔ الفاظ پر یہ قابو اور معانی سے یہ مفاہمت کچھ محمد علی ہی کا حصہ ہے۔ الفاظ و معانی کی یہ فن کارانہ آمیزش و آویزش خود ایک مطالعے کی طالب ہے، مگر اس وقت ہمارے سامنے مصنف کی اور بہت سے خصوصیات اپنی قطار توڑ توڑ کر سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ نفسیات کا ایک بہت بڑا ماہر ہونے کے علاوہ وہ جنسیات کا ایک نہایت صحت مند شارح ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارے بیشتر بزرگوں کے برعکس، محمد علی جنسیات سے کسی قسم کی تنفر آمیز اجنبیت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ وہ نہایت سکون و اطمینان سے اپنے افسانوں اور خاکوں میں اس کی معمولی اور غیر معمولی، نارمل اور ایب نارمل کیفیتوں کا امتحان اور تجزیہ کرتے ہیں اور وہ گھناؤنا تصور دور کرنے میں کاوش کرتے ہیں جو جنس کے متعلق اوّل دن سے ان کے ناظر کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا ہوتا ہے۔ کاوش سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس پر کوئی افسانوی ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ میرا مطلب محض اسی قدر ہے کہ ان کے موضوعات کے انتخاب میں جنس عادتاً ایک اہم حصہ لیتی ہے اور جب وہ اپنے کسی ایسے مطالعے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس سے وہ اپنے ناظر کے لیے کسی قسم کی لذّت کوشی کا سامان بہم نہیں پہنچاتے، بلکہ.....زیر نظر مسئلے کا نہایت بچا تُلا اور صحت مند جائزہ لیتے ہیں اور زندگی کے عوامل میں جنسی کارفرمائیوں کو وہی مرتبہ دیتے ہیں جن کی وہ بجا طور پر حق دار ہیں۔ ان کے یہاں ہمیں دیگر لکھنے والوں کے برعکس، لذت فروشی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اس کے باوجود جو جنسی حقائق انھوں نے بے نقاب کیے ہیں وہ اس ادنیٰ درجے کی ''جنسِ خام'' سے بدرجہا قیمتی ہیں، جو ہمارے بعض مقبول مصنفین آئے دن پیش کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور از بسکہ جنس، زندگی کی ایک بنیادی کیفیت ہے اور اس کے مدّ و جزر میں ایک نہایت اہم پارٹ ادا کرتی ہے، اس لیے ان مشاہدات و محسوسات کے انتخاب میں بھی جو کسی فن کار کو احساس سے صورت میں انتقال کے وقت درپیش ہوتا ہے۔ جنس اپنا پورا حصہ لیتی ہے یہاں تک سب لکھنے والے برابر ہیں۔ لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھیں تو ایک تنہا لغزش یا سارا فرق پیدا کردیتی ہے۔ لذّت کوش جنس فروش علاحدہ ہوجاتے ہیں اور وہ فن کار علاحدہ جو جنس کو دیگر عطیات وہبی کی طرح قدرت کی ایک مقدس اور دل کشا امانت سمجھتے ہیں اور اسے سفلیات سے ہم صحبت اور آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ محمد علی فن کاروں کے اس ثانی الذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہماری زبان میں بے عیب جنسی کہانیاں لکھنے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

آنکھوں کی زبان، تیسری جنس، دھوکا اور ان کا طویل مطالعہ'' جنس'' جس میں کنواری مس ہیلن اور گنجفہ کھیلنے والی رنڈی اور مچھلی والی سے روزانہ مار کھانے والے انسپکٹر صاحب بڑے کینڈے کے کردار ہیں۔ نفسیات'' جنس'' کے نہایت بیش بہا اور نادر نمونے ہیں جو براہ راست زندگی سے حاصل کیے گئے ہیں اور جن میں کوئی بے کار یا مصنوعی رنگ نہیں بھرا گیا، اور نہ کسی قسم کی لذت آفرینی کی کوشش کی گئی ہے۔ چودھری صاحب نے ان بے مثال اور حیرت انگیز افسانوں کے علاوہ اور کہانیاں بھی لکھی ہیں، جن میں امیری کی بُو اودھ کی مٹتی ہوئی شرافت کے ایک دردناک مرثیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہانی اس قابل ہے کہ اسے اردو کی پاکیزہ ترین کہانیوں میں ایک امتیازی مقام دیا جائے۔

اودھ کی معاشرت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ان کا خاص مطالعہ ہے اور اس مطالعے کے بعض پہلو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس مطالعے کے افسانوں میں ہمیں بیشتر ایسے کردار ملتے ہیں جو اسی نسل کے ساتھ ختم ہوجائیں گے۔ وضع داری، افلاس، دوستی، دوست نوازی، فن پردازی، تفریح پرستی، بے نیازی اور استغنا کے چلتے پھرتے مجسمے، کوئی دن کی بات ہے کہ سایوں میں تبدیل ہوجائیں گے، مرزا منش، میٹھا معشوق، خوش مذاقی کے اندھے اور زندگی کا مقصد انھی نادر روزگار لوگوں کی مرقع نگاری ہے، اور اگرچہ انھیں بقائے دوام دینے والے کا قلم ان کے محاسن کی تفصیل میں ایک پُر خلوص اور دل کشا روانی دکھاتا ہے لیکن کبھی کبھی ان کی زمانہ ناشناسی اور واماندگی پر انھیں کچوکے بھی لگاتا جاتا ہے اور عمل میں بعض دفعہ وہ طنز کی رفعتوں پر جا پہنچتا ہے۔ میری ناقص رائے میں محمد علی نے یہ خاکے کسی اصلاح کے خیال سے نہیں لکھے، بلکہ اپنی روزمرّہ زندگی میں ایک مٹتی ہوئی معاشرت کے جو قابلِ لحاظ نمونے وقتاً فوقتاً اس کے سامنے آئے انھیں اس نے ادب کے عجائب خانے میں محفوظ کردیا۔ آنے والی نسلیں ان پہ آنسو بہائیں گی یا ان سے عبرت یا تفریح حاصل کریں گی یہ اس کا دردِ سر نہیں ہے۔

محمد علی کے خیال انگیز افسانوں میں نیلم کا نگ اور گناہ کا خوف ایک خاص

مرتبہ رکھتے ہیں۔ گناہ کا خوف، سماج کی ظواہر پرستی پر ایک لازوال طنز ہے اور نیلم کا تمگ مسیح کے اس قول کی بازگشت، کہ میں انسان سے مایوس نہیں ہوں۔ دونوں کہانیاں حقیقی زندگی کے پس منظر پر ابھری ہیں اور اپنے اندر مسرت اور تفکر کے انمول خزانے پنہاں رکھتی ہیں۔

کہانیوں کے علاوہ محمد علی نے امامن مہری کی زبان سے روزمرہ کے سماجی مسائل پر پانچ طنزیے ایسے بھی لکھے ہیں جنھیں اردو کی انشائے لطیف میں ایک نہایت ممتاز مقام ملنا چاہیے۔ امامن مہری کے فلسفیانہ خیالات پانچ عنوانات پر مشتمل ہیں، ایمان داری بہترین دوراندیشی ہے رکھ رکھاؤ، تیہا، طنطنہ، جوش، غصہ، جذبہ، کام کاج اور خیرخرات۔ ان کے لکھنے کا خیال انھیں Barrypane کی ایک کتاب کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا، میں نے نقشِ اول تو نہیں دیکھا، لیکن نقشِ ثانی اپنی خیال انگیزی اور خلش آفرینی کے اعتبار سے ہمارے طنزیہ ادب میں ایک لاثانی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد علی کی سب سے بڑی جیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو بہ یک وقت خارجی اور داخلی دونوں زاویوں سے دیکھتا ہے اور مقابل کی یہ خصوصیات ایک واحد فن کار میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خارجی محسوسات کو اپنے افکار کا لباس ایسی خوبی سے پہنا دیتا ہے کہ بیشتر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامۂ تنگ اسی صنم عربدہ خو کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ وہ خارجی دنیا کے معمولی سے معمولی واقعات کو اپنے احساسات میں سمو کر انھیں ایک نئی زندگی اور ایک نئے معانی عطا کر دیتا ہے اور جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے تو ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ان میں محرک کون تھا، اور تحریک کس نے پائی۔ مثلاً وہ ایک جگہ گرمیوں کی صبح میں نسیم کی آہستہ روی اور اس کی روانی میں ایک بڑی بی کی مناجات خوانی کا ذکر کرتا ہے۔ جزئیات کا یہ مطالعہ بجائے خود بغایت درجہ حیرت خیز ہے لیکن جب وہ اس تاثر سے کردار زیرنظر کے ایک عمل کی نفسیاتی تعبیر کی طرف لپکتا ہے اور لپکتے ہی تاثر کو مکمل بھی کر لیتا ہے تو حیرت اپنی انگلی دانتوں تلے دبائے رہ جاتی ہے اور آخر میں میں اپنے ممدوح کی نسبت ان الفاظ کو دہرا دینا ہی کافی سمجھتا ہوں جو حال میں میں نے ان کے ایک نمائندہ فن پارے سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔

''چودھری محمد علی کا سا پیرایۂ بیان ہمارے عہد کے کسی افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ حقیقت پروری اس پہ نثار اور دلنوازی اس پہ تصدق ہے اور ان کے لیے انھیں کوئی اہتمام یا تکلف نہیں کرنا پڑتا۔ فطرت ایک ورق روشن کی طرح ان کے پیش نظر رہتی ہے اور اس کے جو اسرار ان کی نگاہِ انتخاب میں سما جاتے ہیں، وہ انھیں بے محابا اپنا لیتے ہیں۔ محمد علی کسی موضوع کو سامنے رکھ کر اس کی تعمیر کے لیے اپنے تخیل سے مسالہ نہیں مانگتا، بلکہ زندگی اپنی بوقلموں کیفیتوں کو لیے ہوئے اس کے پیچھے بھاگتی ہے اور فن کار، جب کبھی اس کا جی چاہتا ہے، اور جو کچھ اس کا جی چاہتا ہے، اس کے دامن دولت سے مٹھیاں بھر بھر کر لے لیتا ہے تو یہ ہے محمد علی، زندگی کا ایک زیرک ناظر، اردو کا ایک صاحب طرز ادیب، اور ہماری زبان کا اولین فطرت نگار۔

□□□

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندو پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کر دی ہے۔

صفحات: 336، قیمت: -/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

فضیل جعفری (ہماری مطبوعات سے)

کمان اور زخم

1947 تک ملک کے جو حالات تھے انھوں نے سیاسی رہنماؤں اور عوام کو ہی نہیں بلکہ ادیبوں اور شاعروں کو بھی کچھ خواب عطا کیے تھے۔ ملک کی آزادی ایک بڑا اور مشترکہ نصب العین تھا۔ علاوہ ازیں، ان کے پاس ادب، سیاست اور سماج کے بارے میں کچھ واضح تصورات تھے لیکن آزادی ملتے ہی عام انسانوں کی طرح شاعروں اور ادیبوں کو بھی، دل دہلا دینے والے اور ہوش گم کردینے والے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، ان سے سبھی واقف ہیں۔ ان حالات میں پروان چڑھنے والی وہ ادبی نسل جو پانچویں دہائی کے بعد ابھری وہ پرانے "عقائد و اعتبار کھو چکی تھی اور نئے عقائد و اعتبارات سے کچھ تو اس لیے محروم رہنا چاہتی تھی کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں جدید ذہن کے لیے "یقین" کے نام پر کسی بھی قسم کی عینیت پسندی، خیال پرستی اور مستقبل کے بارے میں خوش فہمی کا امکان نہیں رہ گیا تھا۔" اس ادبی نسل میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے ابتدا میں کچھ نظریات و عقائد پر ایمان رکھا تھا، جنھیں "حسن سے لگاؤ" کے ساتھ زندگی بھی عزیز تھی اور اس زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کچھ سیاسی، سماجی تصورات کی قوتِ شفا پر اعتماد بھی تھا، لیکن شکست و ریخت کی آندھی آئی تو سارے سرابوں کی حقیقت منکشف ہوگئی۔ نئے نظام، نئے خیال اور نئے انسان کے چہروں سے نقاب اٹھی تو وہی پرانے عفریت نظر آئے۔ رہبروں کا بھرم کھل چکا تھا، نئی نسل تیار شدہ اقدار و نظریات کے ویرانے میں تنہا کھڑی ہوئی تھی، آسمانی بادشاہتوں کی دلکشی تو کبھی کی ختم ہو چکی تھی، اب زمینی جنتوں کے خواب بھی اپنا رنگ و روپ کھو کے خلا میں تحلیل ہوگئے۔ نئی نسل کی رفاقت کے لیے مایوسی، بدظنی، تشکیک، احتجاج اور بغاوت کا ورثہ چھوڑ گئے تھے۔"

(محمود ایاز: کالے کاغذ کی نظمیں (تبصرہ) شب خون، فروری 1968)

محمود ایاز کی یہ تحریر بظاہر 1950 کے آس پاس ابھرنے والی ادبی نسل کے بارے میں ہے جس سے خود ان کا بھی تعلق ہے، لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے اور ذرا ٹھہر کر سوچا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمود ایاز نے وہ تمام خصوصیتیں جو دراصل 1960 کے بعد ابھر کر سامنے آئیں، 1950 کے قریب ابھرنے والے شاعروں اور ادیبوں پر چسپاں کردی ہیں۔ 1950 والی ادبی نسل کو تو ان حالات کا پورا اندازہ بھی نہ تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ اب بھی پوری طرح ترقی پسندوں کے ساتھ تھے اور کچھ لوگ جنھیں ترقی پسندوں کی خامیوں کا اندازہ ہو چکا تھا وہ ان سے الگ نہ ہو کر ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ پہلے گروپ کی نمائندگی خلیل الرحمٰن اعظمی کرتے ہیں اور دوسرے کی باقر مہدی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایک مضمون سے جو، جون 1950 میں شائع ہوا تھا، یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"آج ترقی پسند تحریک جس اسٹیج پر پہنچ گئی ہے اس نے ہمارے سامنے بہت سی چیزیں واضح کردی ہیں۔ عوامی جدوجہد سے دور، حجرے میں بیٹھ کر شاعری کرنے والوں کی کم مائیگی اب بے نقاب ہو چکی ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ شعرا جن کی ایک زمانے میں پرستش کی جاتی تھی آج ان کی شاعری پر بڑھاپا طاری ہے۔ کئی سال بعد جب ان کی چار، پانچ مصرعوں والی کوئی نظم شائع ہوتی ہے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں سوائے فنی تراش خراش، فنی کرتب اور چونکا دینے والے انداز کے کچھ نہیں ہے... نظم میں جس پھیلاؤ، وسعت اور مرکزیت و تسلسل کی ضرورت ہوتی ہے آج کل انھیں شعرا کے یہاں ملتی ہے جن کا شعور نیا ہے اور جو آج جمہوری آواز سے ہم آہنگ ہیں۔ آج جو شاعر حال اور مستقبل سے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں وہ سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی وغیرہ ہیں۔"

باقر مہدی (جن کی کتاب کالے کاغذ کی نظمیں محمود ایاز کے تبصرے کا موضوع ہے) کا مضمون بعنوان "ترقی پسند شاعری کے مسائل" 1952 میں شائع ہوا۔ ان کا نقطۂ نظر خلیل الرحمٰن اعظمی کے نقطۂ نظر سے یقیناً مختلف ہے۔ باقر مہدی نے اس مضمون میں ترقی پسندوں کے میکانکی طرز فکر اور پارٹی لائن کی ذہنی غلامی کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں مواد کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند شاعری میں موضوعات کے محدود ہوجانے کی شکایت کی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ بہت سے ترقی پسند شاعروں کی آزادی کے بعد والی نظموں پر منظوم تقاریر کا دھوکا ہوتا

"کمان اور زخم" سے ماخوذ، مصنف: **فضیل جعفری** / صفحات۔300، قیمت: -/165 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ہے۔لیکن بہ حیثیت مجموعی اس پورے مضمون میں باقر مہدی کا پوز ایک مصلح کا رہتا ہے نہ کہ سرکش اور متشکک کا۔ وہ ترقی پسند شاعری سے سطحیت اور جذباتیت کو دور کرنے کے متعلق سوچتے ہیں نہ کہ اسے رد کرنے کے بارے میں۔اس مضمون میں وہ شاعر اور شہری کے منصب میں بھی فرق نہیں کرتے اور شاعر کو اس عام شہری کی طرح ہی سمجھتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔اتنا ہی نہیں بلکہ وہ میراجی وغیرہ کی شاعری کی بالکل اسی انداز میں مذمت کرتے ہیں جو قدامت پرست ترقی پسندوں کا شیوہ تھا۔ملاحظہ ہو:

''ان شعرا کا علم مختلف راہوں پر گامزن تھا اور وہ خالص شاعری کی دھن میں زندگی کے مثباتی میلانات کے ترجمان ہونے کے بجائے اپنے بیمار ذہنوں کی الجھنوں کو آزاد نظم کے فارم میں پیش کرتے تھے۔ یہ روایت مغرب سے چند بیمار دانشوروں کے ذریعے اردو شاعری تک پہنچی۔ سرّیت یا سرریلزم اور دادا ازم مغربی یورپ کے ذہنی خلفشار کی ادبی تحریکیں تھیں۔''

سرریلزم کے بارے میں بطور خاص باقر مہدی کا خیال تھا کہ:

''یہ تحریک دراصل انفرادی ناآسودہ جذبات کی نکاس کا شعری ذریعہ بن گئی تھی'' اور یہ کہ ''یہ تحریک آگے چل کر جنسی غلاظت میں ڈوب گئی...جدید اردو شاعری میں یہ تصور میراجی کے گروہ اور حسن عسکری کے طفیل آج بھی ایک ادبی حلقے کی رہنمائی کر رہا ہے۔''

دراصل میں یہاں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ 1950 کے قریب ابھرنے والے نوجوان شعرا و ادبا ترقی پسند لیڈر شپ سے کئی معاملات میں اختلاف کرنے کے باوجود بہت کچھ اسی کے اثر میں تھے۔ان پر ممتاز حسین اور مجتبیٰ حسین کی تنقید کا اثر بہت گہرا تھا۔تشکیک، عقائد پر سے اعتبار اٹھ جانا اور اقدار کی شکست و ریخت کا احساس جیسی چیزیں 1960 کے بعد ہی اردو ادب میں اہم مسائل کی صورت میں ابھریں۔ لوگوں پر یہ حقیقت بھی 1960 کے بعد ہی منکشف ہوئی کہ سرریلزم اور دادا ازم وغیرہ بیمار ذہنوں کی نہیں بلکہ انقلابی تحریکیں تھیں۔ اس طرح میں یہ سمجھتا ہوں کہ جدیدیت کے متعلق وہ تمام خصائص جن کا ذکر محمود ایاز کے متذکرہ بالا تبصرے سے ملتا ہے، ان کا تعلق 1960 کے بعد والی شاعری سے ہی ہے۔ 1950 والی ادبی نسل کے نمائندہ ادیبوں میں سوائے باقر مہدی کے کسی نے جدیدیت کا مفہوم سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں ان باتوں کی تفصیل میں اس لیے جا رہا ہوں کہ محمود ایاز کے جس تبصرے کا حوالہ دیا گیا ہے، اسی میں موصوف 1960 کے بعد والی شاعری کی تمام خصوصیتوں کو اپنا لینے کے بعد اور 1950 والے شاعروں یعنی اپنے ساتھیوں اور ہم عمروں کو دل کھول کر داد دینے کے بعد 1960 کے آس پاس ابھرنے والے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''پچھلے چار پانچ سال میں ایک اور نسل وجود میں آگئی ہے... 1950 والی نئی نسل ناقابل تشخیص نہیں تھی لیکن یہ جدید ترین نسل خلا کی مخلوق ہے۔ اس کی اہمیت لونڈے لپاڑیوں کی اودھم بازی سے زیادہ نہیں، لیکن نئی نسل کے جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان کی پہچان اور تمیز نہیں کی گئی تو اس نومولود نسل کے گناہوں کا خمیازہ نئی نسل کے سبک ساران ساحل کے ساتھ اول الذکر گروہ کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نئی نسل کے بارے میں شکوک اور غلط فہمیوں کی جو دھند پھیلی ہوئی ہے وہ اور زیادہ گہری ہوتی جائے گی۔''

قطع نظر اس کے کہ سبک ساران ساحل تو کب کے کنارے لگ چکے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ محمود ایاز کا یہ رویہ جدید ادیب کا رویہ نہیں بلکہ خالص ترقی پسند نظریہ ہے جس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں میں خود محمود ایاز کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ بہرحال محمود ایاز کی تحریر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ 1960 کے لگ بھگ ایک نئی ادبی نسل وجود میں آ چکی تھی اور یہ نسل نہ صرف ترقی پسندوں سے مختلف تھی بلکہ کئی معاملات میں اپنے فوری پیش روؤں سے بھی مختلف تھی۔ ویسے اب اس نسل اور اس کے قریبی پیش روؤں میں سے بعض فنکاروں کے درمیان کوئی ذہنی بعد نہیں رہا کیونکہ ان فنکاروں نے اپنے ابتدائی موقف پر اڑے رہنے کے بجائے بدلے ہوئے حالات میں ادب کے تقاضوں کو سمجھا اور اس سے ہم آہنگ ہو گئے۔ مثال کے طور پر وحید اختر کی ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے عزت کرتے ہیں۔ متعدد جدید ادیب اپنے مضامین میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اچھا اور جدید ہم معنی اصطلاحیں نہیں ہیں۔

1947 بلکہ اس کے کچھ بعد تک جو سیاسی اور سماجی حالات تھے ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ 1947 اور 1960 کے درمیانی عرصے میں کافی پانی پل کے نیچے سے بہہ چکا تھا۔ 1960 کے فوراً بعد پیش آنے والے حالات نے یہ بات سب کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دی کہ نظریہ (Ideology) اور عینیت پرستی (Idealims) پُر امن دنوں کے مجلسی بہلاوے اور ثقافتی غمزے ہیں۔ یہ چیزیں بین الاقوامی سطح پر ملکوں اور قوموں کے بیچ مفاہمت کا پل بننے کے بجائے محض لفظوں کا پل بن کر رہ جاتی ہیں۔ اقتدار اور زمینی پھیلاؤ کی خواہش ہر فلسفے کو منہدم کر دیتی ہے۔ اسی طرح قومی سطح پر بڑھتی ہوئی بے ایمانی، منافع خوری، تخریبی قوتوں کا ارتقا اور اصولوں کو ذاتی یا گروہی مصلحتوں پر قربان کر دینے کے نئے اصول وغیرہ نے نئے شاعروں اور ادیبوں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ تخلیق، جنھیں اساتذہ

اولادِ معنوی سے تعبیر کرتے تھے بسا اوقات ہنگامی اور وقتی سیاست کی تابع مہمل بن کر رہ جاتی ہیں، اور وہ بھی اس حد تک کہ شاعر اور ادیب اپنی تخالیق کو واپس لینے یعنی اپنی جائز اولاد کو حرامی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر آخر ایسی اولاد پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جنھیں ایک دن آپ کو ناجائز اولاد کہنا پڑے۔ یہیں سے نئے ادیبوں کے یہاں مایوسی، تشکیک، بدظنی، گندی اور خود غرض سیاست سے نفرت اور سماج کی مروجہ اقدار سے بغاوت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی جذبۂ بغاوت کا دوسرا اور ادبی نام ''جدیدیت'' ہے!!

ہر زمانے کے نئے ادبی رجحانات کی طرح اس رجحان نے بھی پہلے سے موجود ادبی حکمراں طبقے کے اعتقادات اور مفادات پر کاری ضرب لگائی۔ ادب کی تاریخ کا نہایت سرسری مطالعہ بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ جب کبھی ادب نئے رجحانات سے ہم کنار ہوتا ہے اور جب کبھی موضوعاتی اور لسانی سطح پر ادب کا معیار بدلتا ہے تو پہلے سے موجود نقادوں کے سامنے صرف دو راستے رہتے ہیں۔ یا تو نقاد اپنے ادبی ذوق اور تنقیدی احساس کی از سرِ نو ترتیب و تہذیب کرے یا پھر وہ نئے رجحانات کو جزوی یا کلی طور پر رد کر دے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، اختر تلہری، ماہر القادری، حامد حسن قادری، یگانہ چنگیزی اور نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی وغیرہ نے جو سخت اور غیر منصفانہ تنقیدیں کیں ان سے لوگ بالکل واقف ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک اقتباس پیش کروں گا۔ ملاحظہ ہو:

''ان لوگوں کا، ادب برائے زندگی کا نظریہ دراصل روسی اشتراکی لٹریچر کا بگڑا ہوا خاکہ ہے، جسے خود روس پچاس برس پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ایسی شاعری کیا خاک کامیاب ہو سکتی ہے، جس میں خلاقانہ تخئیل معدوم ہو اور جس میں حقائق کی ترجمانی کے بجائے فرسودہ بدیسی تحریکات کو ہندوستان منتقل کر کے ان کی مبالغہ آمیز اور سفیہانہ نقالی کی گئی ہو۔ وہ محض ''الفاظ'' ہیں۔ میدانِ عمل میں ان کے دشمن بھٹکیں۔ یہ ایسی شاعری ہے جو کسی خاص مقصد کی تکمیل اور اظہار کے لیے وجود میں نہیں آئی بلکہ لائی گئی ہے۔ اس کے اچھالنے والے چند گم کردہ مدعا بلکہ بر خود غلط نوجوان ہیں اور بس!''

(جعفر علی خاں اثر)

واضح رہے کہ پرانے ادیبوں کی طرف سے، ترقی پسند ادب پر یہ شائستہ ترین تنقید ہے کیونکہ لکھنوی تہذیب اور نفاست زیادہ درشت الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ورنہ یگانہ چنگیزی نے تو ترقی پسند شاعری کو چرکین کی شاعری سے بھی بدتر قرار دیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ ''عمل، مقصد اور حقائق کی ترجمانی'' ترقی پسندی کی کلیدی اصطلاحیں ہیں لیکن اثر لکھنوی ترقی پسند ادب میں ان قدروں کے وجود سے ہی منکر تھے۔ اس زمانے میں جن نقادوں نے ترقی پسند ادب کی الہام و تفہیم کے سلسلے میں بحث کی اور وضاحتی مضامین لکھے ان میں پروفیسر احتشام حسین کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے بجا طور پر ترقی پسند ادب کے تعلق سے بزرگ ادیبوں اور شاعروں کے رویے میں ''خلوص کی کمی، غیض و غضب کی زیادتی اور غور و فکر سے گریز'' کی نشان دہی کی تھی لیکن جیسا کہ روایتی طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر ساس یہ بھول جاتی ہے کہ وہ بھی کبھی بہو تھی، اسی طرح ہر بزرگ ادیب بھی شاید یہ بھول جاتا ہے کہ وہ بھی کبھی نیا ادیب تھا اور اس نے بھی ادب میں سرکش رجحانات کو راہ دی تھی یا ان کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں جدید رجحانات پر پہلا پتھر احتشام صاحب کی طرف سے ہی آیا۔ دیکھیے:

''اس وقت ایک نئی قسم کی رومانیت نے جنم لیا ہے جو بے سمت اور بے جہت ہونے اور راظہار کی انفرادیت سے ذہنی پیچیدگیاں پیدا کرنے میں ہی مسرت محسوس کرتی ہے۔ ایسی شاعری اور فنکاری کوئی جادو نہیں جگاتی، جذبات کے تاروں کو نہیں چھیڑتی، تاثرات کے در نہیں کھولتی، ایک ذہنی تناؤ پیدا کرتی ہے۔ کسی قسم کے احساسِ حسن کو جنم نہیں دیتی۔ اس وقت اس کا دائرہ محدود ہے اور مستقبل تاریک۔''

یوں تو جدیدیت اور جدید رجحانات کی مخالفت اور مذمت کی بہتی گنگا میں سجاد ظہیر اور جگن ناتھ آزاد سے لے کر طلحہ رضوی برق اور رضوان حسین تک سبھی مشہور، گمنام، بوڑھے، جوان، اچھے، برے ادیبوں اور شاعروں نے ہاتھ دھوئے، لیکن جن اہم نقادوں نے (جن کی علمیت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے) جدیدیت پر بہت تفصیل سے لکھا اور ہر زاویے سے اس پر حملے کیے ان میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ عقیل صاحب اپنے مضمون ''نئی شاعری کا منفی کردار'' (مطبوعہ ''کتب'' لکھنؤ) میں فرماتے ہیں:

''اردو ادب میں بھی ہندی اور انگریزی کی طرح ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنی فکر و نظر کی راہیں الگ بنا رہا ہے جو ادب کی تعمیری اور سماجی دھارے سے کٹ کر ایک ایسی دنیا کی تعمیر کر رہا ہے جہاں حسرت و ناکامی، حرماں نصیبی، تاریک مستقبل اور موت ہی آج کے انسان کا مقسوم ہیں۔''

دراصل جدید شاعری کے مخالفین نے اس شاعری میں محض انھی ''خصوصیات'' کی دریافت پر اپنی ساری قوت اور صلاحیت صرف کی ہے۔ عقیل صاحب کے متذکرہ بالا مضمون کا عنوان بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں جدید شاعری کے مجموعی کردار سے نہیں صرف اس کے منفی کردار سے دلچسپی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی کتاب ''نئی علامت نگاری'' میں جدید نظم کی (زیادہ تر) مذمت کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''جدید علامت نگاری اور شاعری کے متعلق خود جدید نقاد اور شاعروں

کے کیا خیالات ہیں وہ بھی قارئین کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔"

اس ضمن میں عقیل صاحب نے وزیر آغا، بلراج کومل اور ظہیر کاشمیری کے مضامین سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس قبیلے نے کئی رنگا رنگ شاعر پیدا کیے ہیں لیکن سب کے سب مبہم، جنسی لذتیت کے مریض، image کو حاصلِ کلام سمجھنے والے اور بداسلوب ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا ہے۔ وہ کسی بھی مثبت قدر کے حامل نہیں ہوتے، اپنے انفرادی کو ذہن میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں اسی کو سند سمجھ بیٹھتے ہیں۔"

(ظہیر کاشمیری: اردو کے ٹیڈی شاعر)

اور پھر عقیل صاحب سوال کرتے ہیں کہ "سب کو جاہل کہنے والے جدید تبصرہ نگار اپنے ان دوستوں کو کیا کہیں گے؟" یہاں میں عقیل صاحب کی خدمت میں دو باتیں عرض کروں گا۔ ایک تو یہ کہ شروع سے ہی اردو ادب میں جدید رویہ اپنانے والوں کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے من حیث القوم نہ تو کسی چیز کو اپنایا ہے، نہ رد کیا ہے۔ چنانچہ وزیر آغا اور بلراج کومل ان جدید لوگوں میں ہیں جو ابھی تک افتخار جالب کی لسانی توڑ پھوڑ سے سمجھوتہ نہیں کر پائے ہیں۔ ظہیر کاشمیری کے سلسلے میں ڈاکٹر عقیل کو زبردست سہو ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور علی سردار جعفری کے ہم عمر اور ہم عصر ظہیر کاشمیری شروع سے ایک غالی ترقی پسند رہے ہیں۔ انھیں جدید شاعر کہنا اور سمجھنا سراسر زیادتی ہے، خود ان کے ساتھ بھی اور جدیدیت کے ساتھ بھی۔ بہر حال، ان باتوں سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں جدیدیت سے زیادہ کسی اور موضوع پر بحث نہیں ہوئی چونکہ جدید ادب کو "جدیدیت" سے وابستہ تصورات کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ جدید نقادوں نے "جدیدیت" سے کیا مراد لی ہے اور کس طرح اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ سوال نہ صرف عام قارئین بلکہ ادب کے نقادوں کی طرف سے برابر اٹھایا جاتا رہا ہے کہ آخر جدیدیت ہے کیا؟ وارث علوی تک نے اس بات کی شکایت کی ہے کہ جدیدیت کے مفہوم کے سلسلے میں خود ادیبوں کے یہاں فکری "انتشار" پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیبوں اور نقادوں کے چھوٹے سے چھوٹے گروپ میں بھی ادبی اصطلاحات کے متعلق اختلافِ رائے ہوسکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ یہ اختلاف اس وقت اور بھی شدت اختیار کرلیتا ہے جب نقاد، اصطلاحوں کو تخلیقی کی مدد سے نہیں بلکہ سماجی، نفسیاتی اور فلسفیانہ عوامل کی مدد سے سمجھنے لگتے ہیں۔ قدیم و جدید سے قطع نظر، اردو کے جن نقادوں نے جدیدیت کے مفہوم اور اس کے متعلقات سے مفصل بحث کی ہے ان میں آل احمد سرور، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر محمد حسن، باقر مہدی، شمس الرحمٰن فاروقی، عمیق حنفی اور بشر نواز وغیرہ خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جدیدیت کے بارے میں بات کرتے ہوئے اگر ایک طرف سرور صاحب روسو، فرائڈ، مارکس اور ڈارون وغیرہ سے رجوع کرتے ہیں تو دوسری طرف وحید اختر سائنسی انقلاب، صنعتی تہذیب، سوشلزم، ہیگل کے تصورِ عقلیت اور وجودیت وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔ وحید اختر نے تو یہ لکھ کر کہ "جدید شاعر کی تنقید کے لیے میرا بنیادی معیار میری اپنی شاعری ہے" ایک خالص ادبی مسئلے کو نفسیاتی مسئلہ بنا دیا ہے۔ ان کے اس بیان کی روشنی میں اگر ان کے مشہور جملے "جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے" کو پرکھا جائے تو بات نہ صرف واضح ہوجاتی ہے، بلکہ کسی قسم کی بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اس سلسلے میں کئی لکھنے والوں نے اپنی گالم گلوج کا زیادہ تر نشانہ وحید اختر کو بنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت کے سلسلے میں وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی اور آل احمد سرور کے خیالات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ تینوں حضرات اس مسئلے پر متفق ہیں کہ جدیدیت ایک مستقل تاریخی عمل ہے اور اسے روایت سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا:

(1) "جدیدیت ایک ایسا مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔"

(وحید اختر)

(2) "جدیدیت خلا میں لٹکی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ اس کی جڑیں اپنی روایت میں ہوتی ہیں۔ جو شاعری اپنے ماضی سے بالکل کٹ کر جدید ہوگی وہ صحیح معنوں میں جدید بھی نہ ہوگی۔"

(ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)

(3) "جدیدیت ایک مستقل قدر ہے، اس لیے کہ زندگی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔"

(آل احمد سرور)

تاریخی تسلسل کے علاوہ یہ تینوں نقاد اس مسئلے پر بھی متفق ہیں کہ جدید شاعروں کے دو گروہ ہیں۔ ایک "اصلی جدید" شاعروں کا گروہ اور دوسرا "نقلی جدید" شاعروں کا۔ نقلی جدید شاعر جدیدیت کے نام پر محض شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ علم و ادب کے لیے ایک بڑا خطرہ ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح پوری انسانیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ مزید تین اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(1) "ایک وہ (جدید شاعروں کا گروہ) جو جدیدیت کی روح کو سمجھتا ہے اور اس کے ہر روپ کا تجزیہ کرکے اس سے مناسب توانائی اخذ کرتا ہے مگر دوسرا گروہ موجودہ آزادیٔ خیال اور جدید نسل کی ہر خلیج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

اپنے وجود کی اہمیت کو منوانے کے لیے جدیدیت کے نام پر سماجی، اخلاقی اور تہذیبی ذمے داری سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔''

(آل احمد سرور: جدیدیت اور جدت پرستی کے مضمرات)

(2) ''میں نے ادھر کچھ مضامین نئی شاعری پر پرانے نقادوں کے دیکھے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ نئے شاعروں کی نظمیں سمجھ میں نہیں آتیں، نئے شاعر اپنے ذاتی خول میں بند ہوگئے ہیں۔ ان کے یہاں اپنے زمانے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ یہ داخلیت کے بھول بھلیاں میں قید ہیں۔ یہ صرف ٹیڑھی میڑھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور بعض نئے شاعروں کے یہاں موجود ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی نئے شاعروں کے یہاں بہت کچھ ہے اور ان کے علاوہ بھی نئے شاعر ہیں۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی: نئے شعری رجحانات)

(3) ''اس ہجوم میں ''اہم'' شاعروں کی آوازوں کی انفرادیت اور امکانات ابھرنے نہیں پائے بلکہ کچھ دب سے گئے ہیں۔ اکثریت ان شاعروں کی ہے جنھوں نے جدیدیت کو فیشن بن جانے کے بعد اختیار کیا ہے اور چند فارمولوں کو ہی جدیدیت سمجھتے ہیں۔''

(وحید اختر: جدید شاعری کا مطالعہ ''نئے نام'' کی روشنی میں)

یہ تمام اقتباسات کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر محمد حسن کے ''نئی جدیدیت اور نئی ترقی پسندی'' والے فارمولے کو چکاتے اور آگے بڑھاتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ڈاکٹر وحید اختر کا تیار کیا ہوا ترقی پسندی اور جدیدیت کا معجون مرکب بھی چکھتے چلیے۔ فرماتے ہیں کہ ''اگر ترقی پسندی میں سے ادعائیت اور سیاسی انتہا پسندی کو نکال دیا جائے اور جدیدیت میں سیاسی، سماجی شعور کو ممنوعات میں داخل نہ کیا جائے، تو دونوں میں بعد نہیں رہتا۔'' ساری مصیبت یہ ہوئی کہ ان حضرات نے جدیدیت پر بات کرتے ہوئے پچھلے پندرہ بیس برسوں میں تخلیق کردہ ادب کو ماخذ بنانے کے بجائے جدیدیت کے رجحان کو Idealise کرنے اور جدید ادب میں ساری دنیا کے بہترین ادب کی بہترین خصوصیات تھیوریٹکل طور پر جمع کردینے کی کوشش کی۔ جیسا کہ باقر مہدی نے اپنے مضمون ''جدیدیت اور توازن'' میں لکھا ہے کہ ان حضرات کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ جدیدیت سے اس کے Sting کو نکال کر اسے بے ضرر سی چیز بنا دیا جائے تاکہ وہ دیوان خانوں کی زینت بن سکے۔'' جدیدیت کے سلسلے میں کنفیوژن پیدا کرنے میں عمیق حنفی نے بھی کوئی معمولی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ناراض ہوئے تو جدید شاعری کے علاوہ ساری شاعری کو نقالی اور بھٹئی سے تعبیر کیا اور خوش ہوئے تو فیض، مخدوم اور سردار کی ہی نہیں بلکہ مخمور جالندھری، رفعت سروش اور فکر تونسوی تک کی وہ نظمیں ''جن میں خطابت تبلیغ مقاصد اور عقائد کے بجائے اظہار ذات ہوا ہے'' نئی شاعری کی اچھی مثالیں نظر آنے لگیں۔

مختصر یہ کہ ان تمام حضرات نے جدیدیت کو محض چند فارمولوں تک محدود رکھا۔ چونکہ ان لوگوں نے ادب کی تاریخ کے مطالعے سے صحیح نتائج اخذ نہیں کیے اس لیے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اگر جدیدیت کی کوئی روایت ہوسکتی ہے تو وہ غیر روایتی روایت ہوگی اور جدیدیت کی پہلی شرط ہی یہی ہے (جیسا کہ جدید اردو شاعری سے ثابت ہوتا ہے) کہ وہ تاریخی تسلسل کو توڑے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جدیدیت کوئی ایسا آفاقی تصور نہیں ہے جس کا مفہوم ہر زمانے میں اور ہر زبان میں یکساں ہو۔ مثلاً یہ کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں انگریزی زبان میں جو جدید رجحان تھا یعنی ایلیٹ کی جدیدیت، وہ اقدار کی پرکھ اور ان کا از سر نو تعین، کلاسیکی معیاروں کا احیا، لہجے کی پیچیدگی اور انفرادیت پر زور، سے عبارت تھا، جبکہ انھیں دنوں وسطی یورپ اور اسپین میں جدیدیت کا مطلب سماجی انقلاب کی خواہش، نیز ترقی پسند اور بائیں بازو کی سیاست سے براہ راست تعلق تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو میں جدیدیت کی بات کرتے ہوئے اردو کی جدید شاعری کو ہی ذہن میں رکھنا ہوگا۔

میں نے اوپر، تاریخی تسلسل کے توڑنے کو جدیدیت کی اہم شرط قرار دی ہے۔ جن لوگوں نے اردو زبان و ادب کے پس منظر میں جدیدیت کے رجحان پر لکھا ہے ان میں باقر مہدی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضامین میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ فاروقی نے اپنے مضمون ''نئی شاعری... ایک امتحان'' میں اس بات پر زور دیا ہے کہ چونکہ نئی شاعری کے محرکات ترقی پسند شاعری کے محرکات سے مختلف ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ یہ شاعری ترقی پسند شاعری سے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں اس سچائی کو بھی تسلیم کیا ہے کہ ''نئی شاعری ترقی پسند شاعری کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوئی ہے''۔ ویسے فاروقی کے اس بیان سے بعض دوسرے جدید ادیبوں کو جزوی طور پر اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس مسئلے پر باقر مہدی یوں رقمطراز ہیں:

''نئی نسل اب ایک شاخ ہی نہیں بلکہ الگ ایک پودا ہے اور وہ پچھلی نسل سے برسرِ پیکار ہے... جدیدیت انسان کو ایک فرد سمجھتی ہے۔ لاشعور اور شعور کی آویزش کو زندگی کی دلیل اور شخصیات کے پروان چڑھنے کا ذریعہ سمجھتی ہے، جدیدیت ایک طرف تو اقدار کے پیمانوں کو رد کرتی ہے تو دوسری طرف ذاتی تجربے اور جستجو کو لبیک کہتی ہے... وہ شہری کے رول اور شاعر کے منصب میں فرق کرتی ہے... جدیدیت تعمیر اور تخریب کی پرفریب اصطلاحوں کو رد کرتی ہے، وہ ادب کو سب سے پہلے ذات کا آئینہ قرار دیتی ہے لیکن ذات کو حرف آخر نہیں سمجھتی اس لیے کہ جدیدیت حرف آخر کی سرے سے قائل نہیں ہے۔''

اردو میں جدیدیت کے رجحان کے تعلق سے یہ وہ خیالات ہیں جو جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیق کے براہ راست اور بغور مطالعے سے اخذ کیے گئے ہیں، نہ کہ فلسفیوں، ماہرین نفسیات واخلاقیات یا سیاسی مدبروں کے افکار سے۔ فاروقی یا باقر مہدی یہ نہیں کہتے کہ جدید شاعری ہی سب کچھ ہے یا جدیدیت ہی زندگی کی سب سے اہم قدر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ شاعری عظیم شاعری ہے یا ترقی پسند شاعری سے بہتر ہے۔ فاروقی اور باقر مہدی اس بات پر بھی متفق ہیں کہ جدید ادب کا گہرا تعلق صنعتی تہذیب سے ہے۔ چنانچہ جدید ادب میں خوف، تنہائی، احساسِ جرم اور انتشار وغیرہ کا احساس پایا جانا فطری بات ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب کی قدریں بدل چکی ہیں اور ہم ایک نئے ادبی انقلاب سے دوچار ہوچکے ہیں۔ جب باقر مہدی ادیب سے سرکشی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ادیب ساری دنیا کے پیچھے ڈنڈا لے کر بھاگتا پھرے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ ادب کے مروجہ معیارات کو ردوقبول کے تنقیدی عمل سے گذاریں کیونکہ ایسا کیے بغیر ادب کی نئی اقدار کی تشکیل ناممکن ہے۔ پہلے یہ دیکھیں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کتنا ادب ہے نہ یہ کہ اس میں کتنی سیاست ہے یا نفسیات ہے یا کتنا اجتماعی شعور ہے یا اس ادب کو پڑھ کر آدمی کتنا نیک بن سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بودلیئر کا مندرجۂ ذیل بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہمارے بہت سے نقادوں نے بودلیئر کو انسان دشمن اور سماجی اقدار کی نفی کرنے والا ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ شاعری کے فن پر لکچر دیتے ہوئے بودلیئر نے نہایت ہی واضح الفاظ میں اپنے موقف کا اظہار یوں کیا ہے:

"براہ کرم، اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ میرا کبھی بھی یہ مطلب نہیں رہا کہ شاعری انسان کو نیک کردار نہیں بناتی یا شاعری اپنی ارفع ترین شکل میں، انسان کو روزمرہ کے معمولی واقعات سے اوپر نہیں اٹھاتی۔ ایسا کہنا بے معنی ہوگا۔ لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ شاعر اگر قصداً اخلاقیات کا درس دے تو اس کی شاعری کی قوت کم ہوجاتی ہے اور اس طرح اکثر کمتر درجے کی شاعری تخلیق ہوتی ہے۔ شاعری سائنس کی سرد واقعیت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ خالص عقلیت کا مطلب محض صداقت ہوتا ہے جبکہ شعری ذوق حسن کو پرکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔"

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا جدید رجحانات یا تنقید میں جدید نقطۂ نظر کا پیدا ہونا کل کی بات ہے؟ جی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی تسلسل کی عدم موجودگی کے باوجود، فراق، کلیم الدین احمد، میراجی اور حسن عسکری کی تحریروں میں ہمیں جدید نقطۂ نظر کی کہیں ہلکی اور کہیں گہری پرچھائیاں مل جاتی ہیں۔ □□□

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے اہم جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب "نئی شعری روایت" نے اردو میں جدیدیت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تین مستقل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات لکھا گیا ہے، دوسرا باب نئی جمالیات اور تخلیقی عمل ہے اور تیسرا اظہار وابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

صفحات: 240، قیمت -/127 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبر نامہ

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کا 20واں اجلاس
ڈاکٹر علی جاوید صدر منتخب

● سرینگر۔ 30 جولائی، انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کا 20واں کل ہند دو روزہ اجلاس شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے سرینگر میں 29-30 جولائی کو منعقد کیا گیا۔ اس میں 100 سے زائد اردو اساتذہ اور مختلف ریاستوں سے آئے شرکا نیز مقامی اہم ادبی اور علمی شخصیات نے حصہ لیا۔

دلی، یوپی، پنجاب، بہار، بڑودہ اور جموں و کشمیر ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں سے تشریف لائے تمام اساتذہ 29/جولائی کی صبح 10:30 بجے کشمیر یونیورسٹی کے گاندھی بھون پہنچے۔ جہاں افتتاحی اجلاس کے مہمان ذی وقار ریاست کے گورنر عالی جناب این.این.ووہرا کے آنے سے قبل کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ریاض پنجابی اور جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجابھ متو بھی پہنچ چکے تھے۔ ٹھیک 11 بجے گورنر صاحب تشریف لائے، اس کے بعد گل پوشی کی رسم شروع ہوئی۔ ڈائس پر عالیجناب این این ووہرا، پروفیسر ریاض پنجابی، پروفیسر اجابھ متو، ڈاکٹر علی جاوید کا استقبال فیکلٹی ممبران نے گلدستہ اور سماوار پیش کر کے کیا۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر نذیر ملک نے استقبالیہ تقریر پیش کی جبکہ نظامت کے فرائض پروفیسر مجید مضمر نے انجام دیے۔

جموں و کشمیر کے گورنر و کشمیر یونیورسٹی کے چانسلر عالی جناب این. این. ووہرا نے اجلاس کا افتتاح کرنے کے بعد اردو کو ایک بین الاقوامی زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کا تعلق نہ صرف برصغیر کے ممالک ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے ہے بلکہ وسط ایشیا و خلیجی ممالک، برطانیہ، یوروپ اور امریکہ میں بھی اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی کافی تعداد ہے۔ اگر اردو کی ترقی و ترویج ہوتی ہے، تو عالمی سطح پر یہ سب کے لیے مفید ہوگا۔ جناب ووہرا نے واضح الفاظ میں کہا کہ برصغیر میں اس مشترکہ زبان کی 600-500 سالہ پرانی تاریخ ہے اور اس وراثت کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ انھوں نے یقین دہانی کرائی کہ میرے دائرہ اختیار میں جو ہوگا اردو زبان کے فروغ کے لیے کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ دو روزہ اساتذہ کی کانفرنس کے بعد جو تجاویز و سفارشات میرے پاس آئیں گی، ان پر مثبت اقدام لینے کی کوشش کروں گا۔ انھوں نے اس بات پر سخت تشویش کا اظہار کیا کہ ملک کی تقسیم کے بعد اردو کو ایک خاص مذہب و قوم سے جوڑ دیا گیا ہے۔ گورنر نے لاہور میں اپنے بچپن کے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ جب ہمارا خاندان پاکستان میں تھا تو اسکولوں میں اردو تدریس کا معقول انتظام نہیں تھا، تب ہم نے ایک مذہبی عمارت کے آنگن میں مولوی صاحب کے پاس زمین پر بیٹھ کر اردو کی تعلیم حاصل کی۔ آخر میں جناب ووہرا نے وائس چانسلر ریاض پنجابی اور انجمن کا شکریہ ادا کیا، جنھوں نے اس کانفرنس کا انعقاد کر کے انھیں اردو سے متعلق اظہار خیال کا موقع دیا۔ اس سے قبل پروفیسر ریاض پنجابی نے اپنی صدارتی تقریر میں ریاست جموں و کشمیر کے گورنر ووہرا کے بارے میں کہا کہ وہ ایک انسان دوست اور اردو نواز شخصیت کے روپ میں پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق برصغیر کے اس ملک اور اس صوبے سے ہے، جس کا اردو زبان و ادب میں منفرد مقام ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر ووہرا نہ صرف اردو ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ آج بھی بڑی خوش خط اردو لکھتے ہیں اور اسی مہذب زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ پروفیسر ریاض پنجابی نے اردو اساتذہ جامعات ہند کی کانفرنس کے موقعے پر اردو درس و تدریس کی ترقی کے لیے انقلابی سطح پر اقدام اٹھانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ زبان کے تحفظ کے لیے ہمیں صرف مشاعروں اور ادبی تقریبات پر انحصار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ تعلیمی اداروں کی سطح پر اہم فیصلے لینے ہوں گے تاکہ Decision Maker اردو تدریس کے حوالے سے مثبت پالیسیاں بنائیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر اور انجمن اساتذہ جامعات ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی جاوید نے اپنے کلیدی خطبے میں اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ ملک کی 17 ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہیں، جبکہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کے سرکاری زبان ہونے کے باوجود اردو اکادمی قائم نہیں ہو سکی۔ انھوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ ریاست میں جموں اور اس کے اطراف اور لداخ میں کئی علاقے ایسے ہیں، جہاں اسکولوں میں ابتدائی اردو تدریس کا معقول انتظام نہیں ہے، نیز اردو کو وہ مراعات بھی حاصل نہیں ہیں، جو دوسری زبانوں کو حاصل ہیں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے ریاست میں اردو بولنے والوں کے تناسب سے اسکولوں میں اردو اساتذہ کے تقرر کا بھی مطالبہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کونسل کی طرف سے گذشتہ دنوں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) دلی میں منعقد ورکشاپ میں فیصلہ لیا گیا ہے کہ ملک بھر میں اردو کے حوالے سے 80 فیصد نصاب تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں یکساں ہوگا، جبکہ 20 فیصد مقامی ضرورت کے

مطابق ہوگا اور اسی مقصد سے ہم یہاں یکجا ہوئے ہیں اور باقی سیشن میں اسی پر کام کیا جائے گا۔

مہمان خصوصی اور جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امیتابھ مٹو نے بھی اپنی تقریر میں اردو زبان کو وسعت دینے اور اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو کی شیرینی کا تو میں ہمیشہ سے قائل تھا، لیکن جب پچھلے سال پٹنی ٹاپ میں انجمن کی کانفرنس منعقد ہوئی، تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ اردو ایک سیکولر زبان ہے، یہ ہماری قومی زبان ہے، جو پورے برصغیر کو جوڑتی ہے، امن قائم کرتی ہے۔ پروگرام کے اختتام پر انجمن کے ریجنل سکریٹری پروفیسر شہاب عنایت ملک نے معزز مہمان، اردو اساتذہ، خاص طور سے بیرون ریاست سے آئے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس میں اردو اساتذہ کے علاوہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے کئی ادیب، محقق، شاعر اور اسکالر بھی موجود تھے۔ جن میں ڈویژنل کمشنر سری نگر مسعود سامون، پروفیسر رحمٰن راہی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب دیپک بدکی، پروفیسر فیاض احمد، غلام نبی خیال، محترمہ ترنم ریاض پنجابی، ملک عبدالعزیز، ڈاکٹر شیخ بشیر، ڈاکٹر غلام محمد بٹ وغیرہ شامل تھے۔

کانفرنس کی باقاعدہ کارروائی دوپہر کے کھانے کے بعد 2.30 بجے گاندھی بھون میں شروع ہوئی۔ این.سی.پی.یو.ایل. کی گذشتہ ورک شاپ کے مطابق یونیورسٹی اور کالجوں کے نصاب کے لیے انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، سرٹیفکیٹ کورس برائے ثانوی زبان اور ڈپلوما ان ماس میڈیا اردو کے لیے مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں، جنھوں نے اپنی اپنی ٹیم کے ساتھ گفتگو کے بعد نصاب کا خاکہ تیار کیا۔

30 جولائی کو گاندھی بھون میں ٹھیک 11 بجے دوسرا سیشن شروع ہوا۔ نصاب پر تبادلۂ خیال کے بعد پوسٹ گریجویٹ نصاب کمیٹی کی کنوینر پروفیسر شفیقہ پروین (جموں یونیورسٹی)، انڈر گریجویٹ نصاب کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر محمد اقبال (مالیر کوٹلہ)، سرٹیفکیٹ اور ایڈوانس سرٹیفکیٹ کورسیز کمیٹی کی کنوینر ڈاکٹر ارجمند آرا (دہلی یونیورسٹی) اور ڈپلوما ان ماس میڈیا اردو نصاب کمیٹی کی کنوینر فرحت رضوی (راشٹریہ سہارا) نے اپنی اپنی رپورٹیں اور سفارشات پیش کیں۔ شرکا نے اس اطلاع پر خوشی کا اظہار کیا کہ کشمیر یونیورسٹی میں ماس میڈیا کورس اردو اگلے سیشن 2009 سے شروع کیا جارہا ہے۔

لنچ کے بعد 3 بجے تیسرے سیشن میں انجمن کے ریجنل سکریٹریوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں اردو کے حوالے سے درس وتدریس کی صورت حال نیز مسائل سے متعلق اپنی اپنی رپورٹیں پیش کیں۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی جاوید نے آخر میں سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے سابقہ کارروائی پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر تمام شرکا کی موجودگی میں 3 اہم قرارداد پیش کی گئیں، جو اتفاق رائے سے منظور کی گئیں وہ درج ذیل ہیں:

پہلی قرارداد: انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند ملک میں امن واتحاد قائم کرنے کے لیے پرعزم ہے اور کسی بھی قسم کے لسانی، ثقافتی نیز مذہبی تعصب و نفرت پھیلانے والی طاقتوں کی شدید الفاظ میں مذمت کرتی ہے۔ سیکولر اقدار کی بقا کے لیے انجمن ہمیشہ پرعزم رہے گی۔

دوسری قرارداد: ریاست جموں وکشمیر ملک کی واحد ریاست ہے، جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ملک کی 17 ریاستوں میں جہاں کی سرکاری زبان اردو نہیں ہے، وہاں اردو اکادمیاں اردو کے فروغ کے لیے کام کررہی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ریاست میں مختلف حکومتوں کے ذریعہ کیے گئے وعدوں کے باوجود ابھی تک اردو اکادمی کا قیام عمل میں نہیں آسکا ہے۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند اردو اکادمی کے قائم نہ ہونے پر زبردست تشویش کا اظہار کرتی ہے اور حکومت جموں وکشمیر سے مطالبہ کرتی ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر اردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا جائے۔

تیسری قرارداد: ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی حیثیت نہ صرف سرکاری زبان کی ہے بلکہ اس زبان نے ریاست کے تینوں خطوں یعنی لداخ، کشمیر اور جموں کو ایک ہی کڑی میں پرو رکھا ہے۔ یہ ریاست کے تینوں خطوں کے رابطے کی زبان بھی ہے۔ صوبہ جموں اور صوبہ لداخ کے اکثر کالجوں اور اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر عمل میں نہیں لایا جارہا ہے، نیز پرائمری اور مڈل سطح کے اسکولوں میں اردو پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند حکومت جموں وکشمیر سے پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ مختلف کالجوں اور اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر عمل میں لائے، نیز پرائمری اور مڈل سطح پر اردو پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام کرے، تاکہ نئی نسل کے ذریعے اردو کی عظیم مشترکہ مذہبی روایات کا تحفظ ہوسکے۔ انجمن اساتذہ، کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد اردو ماس میڈیا کورس کو شروع کرنے کے احکامات جاری کریں۔ حکومت کی جانب سے کشمیر یونیورسٹی میں موجود اردو جرنلزم اور ماس میڈیا کا کورس شروع کیے جانے کے احکامات کا خیر مقدم کرتی ہے۔

مذکورہ تینوں قرارداد اتفاق رائے سے ہاؤس نے پاس کردیں جس کی بنیاد پر انجمن، حکومت جموں وکشمیر کے سامنے اپنی سفارشات ومطالبات رکھے گی۔

اس سیشن میں انجمن کے اراکین کا انتخاب ہاؤس میں موجود تمام اردو اساتذہ نے اتفاق رائے سے کیا۔ اب تک جنرل سکریٹری کے عہدے پر کام کررہے ڈاکٹر علی جاوید کو اتفاق رائے سے انجمن کا صدر منتخب کیا گیا اور ریجنل

سکریٹری کے عہدے پر کام کر رہے پروفیسر شہاب عنایت ملک کو جنرل سکریٹری کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس کے علاوہ 5 نائب صدور کے لیے پروفیسر نذیر احمد ملک (کشمیر یونیورسٹی)، پروفیسر شفیقہ پروین (جموں یونیورسٹی)، ڈاکٹر اقبال احمد (مالیر کوٹلہ، پنجاب)، پروفیسر محمد زاہد (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ یونیورسٹی، بہار) کے ناموں پر بھی سب کو اتفاق رہا۔ ڈاکٹر انور ظہیر (بڑودہ یونیورسٹی، گجرات) اور وادی کشمیر سے ڈاکٹر رشید کو بطور ریجنل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ انجمن کا ہیڈ آفس چونکہ دلی میں ہے، لہٰذا طے پایا کہ خزانچی اور آفس سکریٹری کے عہدوں کے لیے دلی کے افراد کو ہی منتخب کیا جائے، لہٰذا مذکورہ عہدوں پر پہلے سے کام کر رہی ڈاکٹر ارجمند آرا (خزانچی) اور ڈاکٹر ابوبکر عباد آفس سکریٹری کے لیے منتخب ہوئے۔ اتفاق رائے سے یہ بھی طے پایا کہ نو تشکیل کمیٹی 3 سال تک فعال رہے گی۔ آخر میں انجمن کے نو منتخب صدر ڈاکٹر علی جاوید نے اس منتخب کمیٹی کی سرپرستی کے لیے سابق وائس چانسلر (کشمیر یونیورسٹی) پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر ریاض پنجابی اور پروفیسر ایتا بھ مئو کے نام تجویز کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ ان تجربہ کار ہستیوں کی رہنمائی میں انجمن اردو زبان کے لیے مثبت کارہائے نمایاں انجام دے گی۔

چوتھا اور اختتامی سیشن 4.30 بجے پروفیسر ریاض پنجابی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی پروفیسر حامدی کاشمیری نے اپنے اظہار خیال سے اراکین جلسہ کو مستفید کیا۔ انھوں نے اردو اساتذہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ عالمی سطح پر بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، جو جدید دور کا تقاضہ ہیں اور زبان و ادب بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہے۔ تکنیک نے بہت سی چیزیں آسان کر دی ہیں، لیکن گلوبلائزیشن سے ہماری اقدار کو نقصان پہنچا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے کہا کہ درس و تدریس سے جڑے لوگوں کے سامنے آج نئے چیلنج ہیں، جو ہمارے سامنے نہیں تھے۔ عالمی منظرنامے کے پیش نظر زبان کی تدریس اور ادبی تخلیق میں بھی پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں۔ آج اساتذہ کو ہر لحظہ Update ہونا پڑتا ہے۔ نئی نسل کے مطالبے قطعی مختلف ہیں، لہٰذا طریقۂ تدریس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ نئی نسل کے طلبہ کے پاس انفارمیشن کے بہت سے ذرائع ہیں، مثلاً انٹرنیٹ وغیرہ، اس لیے زبان و ادب کا استاد جب کلاس روم میں جائے، تو اسے اپنے باخبر طلبہ کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کچھ عرصے سے یہاں ادبی سرگرمیوں میں جمود سا آ گیا تھا، لیکن پروفیسر ریاض پنجابی کے آ جانے کے بعد یہ جمود ٹوٹا ہے اور زبان و ادب کے لیے فضا سازگار ہو رہی ہے۔

پروفیسر ریاض پنجابی نے اپنی صدارتی تقریر میں انجمن کی دو روزہ کارروائی اور نتائج پر اطمینان کا اظہار کیا اور بتایا کہ کل اجلاس کا افتتاح کرنے کے بعد ریاست کے گورنر این این ووہرا نے خواہش ظاہر کی تھی کہ شعبۂ اردو میں سب سے پہلے ایک فوٹو گیلری قائم کی جائے، جس سے گذشتہ دنوں کی یاد تازہ ہو سکے۔ پروفیسر پنجابی نے یقین دلایا کہ جلد ہی یہاں ادبی سرگرمیوں کا موسم شروع ہوگا۔ انتظامیہ کے لوگ بھی کافی پرجوش ہیں، اس لیے امید ہے کہ جمود ٹوٹے گا۔

(رپورٹ: جاوید رحمانی)

سرسید کے افکار، نظریات عالمی تناظر اور نئی جہتیں

● اورنگ آباد۔ 20 جولائی، سرسید کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس اورنگ آباد مہاراشٹر 20،19 جولائی کو عنوان بالا کے تحت ایک دو روزہ سیمینار منعقد ہوا۔ سرسید کالج کے شعبۂ اردو و عربی کے زیر اہتمام یہ قومی سیمینار کارپوریشن اورنگ آباد کے خوبصورت ہال مولانا آزاد ریسرچ سینٹر میں 19 جولائی کو صبح ساڑھے دس بجے پروفیسر عتیق اللہ کی صدارت میں شروع ہوا۔ سیمینار کا افتتاح ڈاکٹر محمود الرحمٰن سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا۔ آغاز کتاب رشد و ہدایت، سبب فلاح انسانیت کی چند آیات بینات کے ذریعے ہوا جو حافظ و قاری عبدالحکیم نے تلاوت کیں۔ پروفیسر محمد تلاوت علی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں مختلف جامعات اور مختلف صوبوں سے تشریف لائے مہمانان کا پرتپاک استقبال کرتے ہوئے سرسید کے تعلیمی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے اور انھیں عام کرنے کے سلسلے میں توجہ دلائی۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اپنے پرمغز مقالے میں سرسید کی کاوشوں، ان کے مشن کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں اور ان رکاوٹوں سے مردانہ وار گزرنے کی ستائش کرتے ہوئے صلے کی پرواہ کیے بغیر منزل تک پہنچنے کا تذکرہ تاریخی، سماجی، ادبی، اخلاقی اور دینی تناظر میں پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ گفتگو اور مباحثوں میں ہم نے بہت وقت خرچ کر دیا اب عمل کی ضرورت ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان الزامات کا ذکر کیا جو سرسید پر لگائے گئے اور کہا کہ ہمیں سرسید کی لگن اور ان کے عملی جوش و خروش کو اپنے لیے مثال بنانا چاہیے۔ بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی ڈاکٹر ارتکاز افضل نے اپنے کلیدی خطبے میں سرسید کی تڑپ، لگن، جستجو اور حوصلوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریک سرسید کو آگے بڑھانے پر زور دیا۔ صدر اجلاس پروفیسر عتیق اللہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور علی گڑھ کے بنیاد گزار سرسید احمد خاں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ ان میں سے ایک نے اگر دینی قلعے کی بنیاد رکھی تو دوسرے نے قلعے کی حفاظت اور

دشمنوں کو جواب دینے کی خاطر عصری علوم میں مہارت پیدا کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے تاریخی حوالوں سے سرسید کی علمی، ادبی، تاریخی، سماجی اور دینی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے ان پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کی تردید کی۔ اس افتتاحی نشست میں سیمینار کے سرپرست محمد تلاوت علی نے شہر اورنگ آباد سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کے مدیران کا استقبال کیا اور اردو کی خدمت اور ترویج پر انھیں مبارکباد پیش کی۔ افتتاحی تقریب کی نظامت کنوینر سیمینار ڈاکٹر عبدالرشید مدنی نے کی جبکہ سرسید کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شیخ کبیر احمد کے اظہار تشکر پر اس تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ تقریب کے مہمانان اعزازی میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی، جناب ذوالفقار حسین، جناب میر ہاشم اور جناب بشر نواز شامل تھے۔

مقالات کی پہلی نشست ڈاکٹر قاسم امام صدر شعبۂ اردو برہانی کالج ممبئی کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر عتیق اللہ نے ''ابوالکلام آزاد اور سرسید ایک تقابلی مطالعہ'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مولانا آزاد کے نظریات اور سرسید کے افکار دونوں میں توافق اور تباین کی وضاحت کرتے ہوئے دونوں حضرات کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر نعمان خاں پروفیسر شعبۂ لسانیات این.سی.ای.آر.ٹی. نے سرسید کے خطوط کے آئینے میں سرسید کی تحریک کا ذکر کیا اور کہا کہ سرسید کے خطوط ان کے دور کے سماجی حالات کو واضح کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد ہاشم پروفیسر شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی نے اقبال اور سرسید پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عبدالباری صدر، شعبۂ اردو پونا کالج، پونے نے اپنا مقالہ سرسید کی تحریک پر پیش کیا اور تحریک کے مثبت خط وخال کو واضح کرتے ہوئے اس تحریک کو آگے بڑھانے پر زور دیا۔ تھانہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر منور علی رضوی نے سرسید کے تعلیمی مشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کے اس ہمہ گیر مشن کو عام کرنے میں ہم نے بڑی کوتاہی سے کام لیا اگر ہم تعلیم کی توسیع وترقی چاہتے ہیں تو اس مشن کو تقویت پہنچانا ہوگی۔ نشست کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر سلیم محی الدین نے انجام دیے۔

19 جولائی کی شب 8 بجے مولانا آزاد ریسرچ سینٹر پر ایک شب غزل کا اہتمام کیا گیا۔ شہر شولاپور کے نوجوان غزل گائک اتل بیلے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ استاد شعرا کی منتخب غزلیں پیش کیں، جس کو سامعین نے خوب خوب سراہا۔

20 جولائی کو دس بجے صبح مقالات کی دوسری نشست پروفیسر عبدالوہاب جذب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس نشست میں چھ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر محمد خلیل نے ''سرسید کی سائنسی خدمات'' پر تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنا مقالہ ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' کے عنوان سے پڑھا۔ ڈاکٹر قاسم امام نے اپنا مقالہ ''سرسید کے عہد میں اردو شاعری کا فکری رجحان'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید نے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول میں اردو شاعری کا سہارا لیا۔ سرسید جس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وہ دینی بھی تھا اور تعلیمی بھی، سرسید کی زندگی پر خاندان کے فکری اور تعلیمی اثرات کارفرما رہے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر سلیمان خورشید نے اپنا مقالہ ''اسباب بغاوت ہند'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کو تحریر کیے ہوئے ایک سو پچاس برس گزر چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کتاب کی افادیت قائم ہے۔ کتاب میں بغاوت کی ذمے داری سرسید نے انگریزوں پر بھی ڈالی ہے اور انگریزوں کے دلوں میں جو غلط فہمیاں تھیں انھیں دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ سرسید کے نظریۂ تعلیم پر ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر مجید بیدار، پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے مقالے میں کہا کہ سرسید نے مسلمانوں کو سبز باغ نہیں دکھائے بلکہ خلوص کے ساتھ قوم کی سماجی خدمات انجام دیں۔ پروفیسر ظہیر علی نے اپنا مقالہ بعنوان ''سرسید کے سیاسی افکار'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ابتدا میں سرسید احمد خاں سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کے خیالات تبدیل ہوگئے۔ ''اسباب بغاوت ہند'' کو ہماری تاریخ کی کلید کہا جاسکتا ہے۔ سرسید نے دو قسم کی حکومتوں کا ذکر اس میں کیا ہے۔ ایک مہذب طرز حکومت اور دوسری غیر مہذب طرز حکومت۔ سرسید نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ہندوستان کی دو آنکھوں سے تعبیر کیا۔ اس نشست میں ڈاکٹر مسرت فردوس اور ڈاکٹر محمد حسن ندوی نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔ اول الذکر نے ''تحریک سرسید کے اہم ستون'' کے عنوان پر اور موخرالذکر نے سرسید کے سفرناموں پر، ڈاکٹر عبدالرشید مدنی نے ''سرسید اور تہذیب الاخلاق'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ نشست کی صدارت شاہ حسین نہری نے کی نشست کا اختتام تین بجے سہ پہر ہوا۔

سیمینار کی اختتامی نشست ساڑھے تین بجے سہ پہر جناب اسلم مرزا کی صدارت میں ہوئی، جس میں مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالستار دلوی، جناب بشر نواز، خواجہ معین الدین، پروفیسر منور علی رضوی، عبدالوہاب جذب، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر نعمان خاں اور ڈاکٹر قاسم امام شریک تھے۔ اس اختتامی اجلاس میں پروفیسر محمد تلاوت علی نے تمام مقالہ نگار حضرات کا شکریہ ادا کیا وار اس سیمینار کو ایک سنگ میل قرار دیا۔ نیز ہر سال تعلیمی میدان میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والی شخصیت کو سرسید تعلیمی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا۔ اختتامی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر قاسم امام نے انجام دیے اور انھی کے اظہار تشکر پر یہ دو روزہ سیمینار اختتام کو پہنچا۔ (ڈاک سے)

اکیسویں صدی میں پریم چند ادبی ورثے کی معنویت

● نئی دہلی۔ 30 جولائی، آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایڈورڈ سعید ہال میں پریم چند کی 138 ویں سالگرہ کے موقعے پر ''اکیسویں صدی میں پریم چند ادبی ورثے کی معنویت'' کے موضوع پر سیمپوزیم کا انعقاد ہوا، جس کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وی.سی پروفیسر مشیرالحسن نے کیا۔ سیمپوزیم میں شریک راجندر یادو نے کہا کہ پریم چند جس وقت لکھ رہے تھے آج کا وقت اس سے مختلف ہے۔ ہم ان کا کوئی موضوع اٹھا کر دوبارہ نہیں لکھ سکتے اور نہ لکھنا چاہیے۔ ہمیں ان کی دو چیزیں وراثت میں لینی چاہئیں۔ انسانیت کے تئیں ان کا درد اور متوسط درجے کے لوگوں کی دشواریاں اور یہ نقطۂ نظر غلط ہے کہ گاؤں پر لکھنے والے لوگ پریم چند کے قریبی اور اصلی وارث ہیں اور شہر پر لکھنے والے نہیں جبکہ شہر میں بسنے والے لوگ گاؤں سے ہی کٹ کر آتے ہیں۔ پریم چند، گاندھی کے پیرو تھے، وہ پریوار کو توڑنا نہیں چاہتے۔ معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ نہیں بدلنا چاہتے بلکہ خامیاں دور کرنا چاہتے ہیں۔ ٹوٹتا ہوا پریوار ان سے دیکھا نہیں جاتا۔ ڈاکٹر قمر رئیس وائس چیئرمین دہلی اردو اکادمی نے کہا کہ پریم چند 138 ویں سالگرہ کے موقعے پر ہم یہاں اکٹھا ہیں، یہ بہت فخر کی بات ہے کہ پریم چند آرکائیز سب سے پہلے جامعہ میں قائم کیا گیا۔ پریم چند کے خطوط میں اکثر جامعہ کا نام آتا ہے۔ ''کفن'' جیسی شاہکار کہانی جامعہ میں بیٹھ کر لکھی گئی اور یہیں سے شائع ہوئی۔ پریم چند اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب ہیں۔ اس طرح پریم چند وہ ادیب ہیں جس نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ انھوں نے دیہی، شہری دونوں ہی جگہ کی زندگی کو دیکھا تھا۔ وہ پورے معاشرے کو اپنا موضوع بناتے، ان کی کوئی بھی کہانی ہو اس میں یہ خوبی نظر آتی ہے۔ مثلاً ''بازارحسن'' اس میں طوائف کی سرگزشت ہے مگر پڑھنے والوں کو ایسا نہیں محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند کی فکر طوائف کے گرد گھوم رہی ہے۔ پریم چند نے گاندھی سے بہت پہلے دلتوں کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ اس طرح پورا ہندوستان ان کے ناولوں میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ کیا آج ہم اپنے زمانے میں کسی قلم کار کو اپنا ماڈل بنا سکتے ہیں چونکہ آج قلم بڑے ہی دھڑلے سے بک رہا ہے۔ پریم چند کو مختلف راجواڑوں سے پیش کش آئی تھی مگر انھوں نے صاف انکار کردیا تھا اور وہ حسرت موہانی کو اپنا ماڈل مانتے تھے جن کو ایک تحریر کی وجہ سے سال بھر کی جیل ہوگئی تھی۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

اردو شعرا نے جنگ آزادی میں نئی روح پھونک دی

● اٹاوا۔ 31 جولائی، کنیڈا کی مشہور ادبی شخصیت اشفاق حسین کے ادبی ادارے ''اردو انٹرنیشنل'' کے زیراہتمام اردو کے ممتاز اسکالر اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر نارنگ نے 1857 کی جنگ آزادی کے حوالے سے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو شعرا نے ایثار و قربانی او رجرأت سے جنگ آزادی میں ایک نئی روح پھونک دی اور وطنیت کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ انھوں نے جنگ آزادی کے پس منظر اور اس میں اردو شعرا کے ذہنی اور فکری رویوں کو اشعار سے دریافت کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ جن شاعروں نے غدر میں حصہ لیا اور وہ بھی جنھوں نے حصہ نہیں لیا سب کے دل رنج و محن سے چور تھے۔ اپنے معاشرے کی تباہی اور اقتصادی بدحالی کا اکثر شاعروں کو احساس تھا اور اس بنا پر دل ہی دل میں یہ سب انگریزوں کے انسانیت سوز مظالم سے نالاں تھے ورنہ وہ اپنے کلام میں اپنی تباہی اور زبوں حالی کا اتنے بڑے پیانے پر کبھی ماتم نہ کرتے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک وطنیت کے تصور کا تعلق ہے بنیادی طور پر ان دونوں طرح کے شاعروں کے یہاں ایک ہی ہے۔ وطنیت کا قدیم تصور اپنے زمانے کے مخصوص تاریخی عوامل اور سماجی قوتوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس کی بنیاد اتنی سیاسی یا معاشی نہیں جتنی اخلاقی اور مذہبی تھی تاہم یہ تصور ایثار، قربانی، جرأت اور مردانگی کے اعلیٰ جذبات سے مملو تھا۔ اس زمانے میں انگریزوں کی مخالفت اس بنا پر ہوئی کہ ان کی حکومیت میں دین اور مذہب خطرے میں تھا۔ لیکن اضطراب کی ان چنگاریوں کو جب شجاعت او ردلیری کے قدیم اوصاف کی ہوا ملی تو یہ 1857 میں جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف اس سرعت سے پھیل گئیں جس کا انگریزوں کو خواب و خیال تک نہیں تھا۔ قبل ازیں تقریب کا آغاز کرتے ہوئے جناب اشفاق حسین نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا او رپروفیسر گوپی چند نارنگ اور کنیڈا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نارنگ صاحب جب بھی کنیڈا آئے ہیں انھوں نے کوئی نہ کوئی یادگاری خطبہ یہاں ضرور دیا ہے۔ ''واقعۂ کربلا اور اس کا استعاراتی پس منظر''، ''امیر خسرو کا ہندوی کلام''، ''اقبال کا فن'' جیسے یادگاری خطبات اسی شہر میں پہلے پہل پیش کیے گئے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

(ہمارا سماج، دہلی)

بچوں کو اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے

● مراد آباد۔ 29 جولائی، جنگ آزادی میں اپنی عظمت کا پرچم لہرانے والی اردو زبان تقسیم وطن کے بعد جس طرح زوال پذیر ہوئی اس کے لیے ملک کی تقسیم ایک بڑی وجہ ہوسکتی ہے مگر اس سے بھی زیادہ بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندی کو ملک کی قومی زبان قرار دیے جانے کے بعد اہل وطن نے اور خاص طور پر مسلمانوں نے اردو کے ساتھ زبردست بے اعتنائی برتی اور اردو کو پوری طرح

فراموش کرتے ہوئے اپنے بچوں کو اردو تعلیم سے محروم رکھا جس کے نتیجے میں آج ہماری نئی نسل اپنی تہذیب او راپنے تمدن سے بہت دور جاچکی ہے جس کا اثر ہماری دینی تعلیم پر بھی پڑا ہے۔ یہ الفاظ آج یہاں ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری مختار صدیقی نے تنظیم کی اس میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے ادا کیے، جو مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کو قومی یوم تعلیم قرار دیے جانے کے مرکزی حکومت کے اعلان پر اظہار طمانیت کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔

انھوں نے کہا کہ یوپی میں اردو کی حالت آج جتنی ابتر ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں نہیں ہے۔ اردو کے بہی خواہوں کو بے عملی کے حصار سے باہر نکل کر میدان عمل میں سرگرم ہونا چاہیے۔ والدین کو احساس دلا کر قوم کے تمام بچوں کو اردو ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائیں، جیسا کہ جنوبی ہندوستان میں کرناٹک، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں مسلمانوں نے دوسری علاقائی زبانیں ہونے کے باوجود اپنے بچوں کی اردو تعلیم کا بہت اچھا انتظام کیا ہوا ہے۔ مختار صدیقی نے مزید اپیل کی کہ آئندہ 11 نومبر کو پورے ملک میں جوش وخروش کے ساتھ مولانا آزاد کا یوم پیدائش قومی تعلیم ڈے کے طور پر منایا جائے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سائن بورڈ اردو میں لگانے کی ہدایت کا خیر مقدم

● نئی دہلی۔ 30 جولائی، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے ریلوے کے وزیر لالو پرساد یادو کی طرف سے پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پر تمام سائن بورڈ اردو زبان میں بھی لگائے جانے کی ہدایت کا خیرمقدم کرتے ہوئے ان ریاستوں میں بھی ریلوے اسٹیشنوں پر تمام سائن بورڈ اردو میں لگوانے کی اپیل کی ہے جہاں دوسری سرکاری زبان اردو ہے۔ آرگنائزیشن کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے آج یہاں جاری بیان میں کہا کہ ریلوے کے وزیر لالو پرساد یادو کی طرف سے پرانی دہلی اسٹیشن پر تمام سائن بورڈ اردو میں لگانے کی ہدایت قابل تحسین ہے لیکن اردو دہلی کے علاوہ آندھرا پردیش، بہار، اتر پردیش اور جھارکھنڈ کی بھی دوسری سرکاری زبان ہے لہٰذا پورے شمالی ہند کے ریلوے اسٹیشنوں پر تمام سائن بورڈوں کو اردو زبان میں بھی لکھا جانا چاہیے۔ اس سے قومی یکجہتی کے فروغ میں بھی مدد ملے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرکزی حکومت کی آفیشل لینگویج پالیسی کے تحت تمام فارم ہندی اور انگریزی کے علاوہ علاقائی زبان میں بھی شائع کیا جانا چاہئیں، لیکن ریلوے بورڈ نے اس پر آج تک توجہ نہیں دی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو تحقیق کا گرتا معیار

● نئی دہلی۔ 20 جولائی، سرسید فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے مسائل پر سہ روزہ قومی سیمینار کے آخری دن متعدد اسکالروں نے مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت گنگا پرساد ویمل اور خواجہ شاہد نے کی۔ ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے ''اردو تحقیق'' کے معیار پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے اردو تحقیق کے موجودہ معیار پر تشویش کا اظہار کیا او رکہا کہ معیار ریسرچ آج کل عنقا ہے اس کے لیے موجودہ تعلیمی نظام، اساتذۂ کرام، ریسرچ کے نگراں اور خود ریسرچ اسکالر ذمے دار ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ریسرچ کا ایک ایسا نظام مرتب ہونا چاہیے کہ یونیورسٹیاں پورے ملک میں ہونے والی تحقیقات کے موضوعات سے باخبر ہوسکیں۔ پروفیسر اے آر فتیحی نے اردو حروف تہجی اور آفاقی کوڈ پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ دیگر زبانوں کی طرح اردو رسم الخط بھی جدید ٹیکنالوجی سے کماحقہ استفادہ کررہا ہے۔ انھوں نے اردو حروف تہجی کی بنیادی خصوصیات کا ذکر کیا اور تحریر کے ٹیکنکل سیاق پر بطور خاص روشنی ڈالی۔ پروفیسر انیس اشفاق نے اتر پردیش میں اردو کی صورت حال پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ یوپی میں اردو عدم کے دروازے پر کھڑی ہے، یہاں اردو میڈیم اسکول ناپید ہیں اس لیے اردو کی جڑیں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے یونیورسٹیوں کے نصاب اور اردو پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک طلبہ میں لسانی شعور بیدار نہیں ہوگا اور انھیں اس کی مشق نہیں کرائی جائے گی بہتر نتائج سامنے نہیں آسکتے۔ پروفیسر علوی نے اس بات کا بھی شکوہ کیا کہ خود ہمارے گھروں سے اردو غائب ہورہی ہے۔ مشتاق احمد ایڈوکیٹ نے سوال و جواب کے دوران اردو کے آئینی مسئلے اور مختلف عدالتوں میں اردو کی قانونی جنگ کے لیے جاری کوششوں کا ذکر کیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر گنگا پرساد ویمل نے کہا کہ یہ اردو اور ہندی کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ سیاست کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ امریکی ادارے ہندوستان کی مختلف زبانوں کو غیر معمولی اہمیت دے رہے ہیں اور وہاں ہندی اور اردو کی تعلیم دی جارہی ہے مگر ہماری حکومت ان دونوں زبانوں کے تئیں لاپرواہی برت رہی ہے۔ خواجہ شاہد نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ ہم نے جن خطوط پر سیمینار کا آغاز کیا تھا ان پر مثبت انداز میں پیش رفت جاری ہے۔ سیمینار کی آخری نشست کی صدارت عزیز برنی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہندوستان کو آزادی دلانے میں پرنٹ میڈیا کا رول اہم رہا ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ صحافت کو پیشہ نہیں مشن سمجھ کر اختیار کریں۔ سیمینار میں فیروز بخت، ڈاکٹر شعیب رضا وارثی اور زبیر رضوی نے بھی خطاب کیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں

● نئی دہلی۔ 20 جولائی، اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنا درست نہیں ہے۔ البتہ مسلمانوں کے اندر اس زبان کے تئیں جو پیار ہے وہ کسی اور کے اندر نہیں۔ ان خیالات کا اظہار مولانا عمید الزماں کیرانوی جنرل سکریٹری آل انڈیا مجلس مشاورت نے آج یہاں منعقد مظفریہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے سالانہ پروگرام فروغ اردو کانفرنس اور تقسیم انعامات میں کیا۔ پروگرام میں حفاظ، دسویں اور بارھویں کے اردو میڈیم امتحان میں اول آنے والے طلبہ و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔ مفتی عطاء الرحمٰن نے کہا کہ ایران کے جلا وطن امام خمینی نے پیرس میں ایک صحافی کے سوال کہ آپ ایران میں کن سے امید لگائے ہوئے ہیں کہ وہاں تبدیلی آئے گی؟ انھوں نے کہا کہ میں ایران کی ماؤں کی گود میں پل رہے بچوں کی بدولت انقلاب لاؤں گا۔ مولانا نے کہا کہ بچے اگر صحیح پرورش پائیں گے تو شاندار کام انجام دے سکیں گے اور اردو کے ساتھ جو سوتیلا پن ہے اس میں تبدیلی آئے گی۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ والدین بچوں کو یہ نصیحت کریں کہ وہ ڈاکٹر انجینئر سے قبل اچھے انسان بنیں۔ ڈی سی پی جسپال سنگھ نے کہا کہ اعلیٰ تعلیم کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنا چاہیے تاکہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو آسانی ہو، اس سے اردو کو بھی فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ میرے حلقے کے جو اردو میڈیم کے طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں میں ان کی پوری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ رکن اسمبلی چودھری متین احمد نے کہا کہ بچوں کی حوصلہ افزائی سے ان میں نئی طاقت آتی ہے اس لیے بچوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ انھوں نے مظفریہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کو مبارکباد دی، ساتھ ہی پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن پر آنے والے بچوں کے لیے بالترتیب اکیاون سو، اکتیس سو اور اکیس سو روپے انعام دینے کا اعلان کیا۔ ٹرسٹ کے ڈائرکٹر دلشاد قمر مظاہری نے کہا کہ مستقبل میں ٹرسٹ اردو کے حوالے سے مزید پروگرام کا انعقاد کرے گا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

جنگ آزادی پر اوّلین میوزیم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں

● نئی دہلی۔ 4 اگست، جنگ آزادی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ایک بہت ہی نمایاں رول رہا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مؤسسین مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ جنگ آزادی میں شریک رہے ہیں۔ ہندوستان میں آزادی کی تاریخ کو جدید طرز پر بیان کرنے والا کوئی بھی میوزیم نہیں ہے کیونکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا آزادی کی جنگ سے براہ راست تعلق رہا ہے اس لیے جامعہ میں حکومت ہند کے تعاون سے ہندوستان کی آزادی کو ایک مربوط کہانی کی شکل میں بیان کرنے والا یہ واحد میوزیم ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یاسر عرفات ہال میں منعقد پریس کانفرنس میں جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے صحافیوں کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس میوزیم میں معروف و مشہور شخصیات کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ عام ہندوستانیوں خصوصاً دلتوں، مسلمانوں اور اسی طرح دوسرے طبقات کی خدمات پر بھی بھرپور انداز میں کام کیا جائے گا۔ اس میوزیم کا مقصد ہندوستانی معاشرے میں ہم آہنگی، یگانگت اور اتحاد و اتفاق کو فروغ دینا اور جدید نسل کو یہ باور کرانا ہے کہ آزادی تمام ہندوستانیوں کی محنت کا ثمرہ ہے تاکہ عام آدمی کے ذہن میں موجود بدگمانیوں خصوصاً مسلمانوں کے متعلق اور جنگ آزادی میں ان کی خدمات کے متعلق شکوک وشبہات کو دور کرنے میں مدد مل سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی میں صنف نازک کے کارناموں کو بھی اس میوزیم میں نمایاں طور پر دکھایا جائے گا۔ پروفیسر مشیر الحسن نے اس میوزیم کے سلسلے میں حکومتی امداد کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ حکومت کا یو جی سی محکمہ اس سلسلے میں 60 کروڑ روپے کے فنڈ سے تعاون دے رہا ہے، جس کا سنگ بنیاد وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عالی جناب ارجن سنگھ جاری مہینے ہی میں رکھیں گے۔ وائس چانسلر نے امید ظاہر کی کہ اس میوزیم کی تعمیر اور دیگر تمام امور تین سے چار سال کی مدت میں مکمل ہوجائیں گے۔ امید یہ ہے کہ میوزیم طلبہ، اساتذہ اور نئی نسل کی رہنمائی کرنے میں اہم رول ادا کرے گا۔ انھوں نے خاص طور سے اس بات کا ذکر کیا کہ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تہذیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دروازوں کے نام، شعبوں کے نام اور اسی طرح میوزیموں کے نام بھی تاریخی وراثت کو جدید نسل تک منتقل کرنے کے لیے تاریخی شخصیت سے موسوم ہیں۔

(صحافت، دہلی)

اردو کی زبوں حالی کے لیے اردو والے بھی ذمے دار

● اعظم گڑھ۔ 30 جولائی، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر شباب الدین نے اپنے بیان میں کہا کہ اردو کے متعلق جس قدر حکومت عدم توجہی کی وجہ سے موردالزام ہے اسی قدر محبان اردو بھی کم قصوروار نہیں ہیں۔ ڈاکٹر شباب الدین نے کہا کہ آج خود اردو داں طبقے کے گھروں سے اردو ختم ہوتی چلی جارہی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو اسلامی مکاتب و مدارس میں نہیں بھیجتے بلکہ ایسے اسکولوں میں بھیجتے ہیں جہاں اردو نہیں پڑھائی جاتی۔ انھوں نے کہا کہ اردو داں طبقہ خود اردو کی زبوں حالی کا ذمے دار ہے اور یہی حال رہا تو پھر آنے والی نسلیں اردو سے ناواقف رہ جائیں گی۔ انھوں نے

کہا کہ دینی علوم کا تمام تر سرمایہ اردو زبان میں ہے اس لیے اردو سے محرومی دین سے ناواقف بنا دیتی ہے اور ہماری آنے والی نسل صرف نام کی مسلمان رہ جائے گی۔ ڈاکٹر شباب الدین نے کہا کہ اردو زبان نے ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن افسوس کہ آج حکومت ہند اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے بلکہ اعزازی ڈگریاں اردو کی شخصیات کو دے کر مسلمانوں کو خوش کر رہی ہے۔ اس سے اردو کا بھلا ہونے والا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا اردو کا بھلا تبھی ہوگا جب حکومتیں اردو کے فروغ کے لیے عملی قدم اٹھائیں۔ ڈاکٹر شہاب الدین نے کہا کہ نام نہاد مسلم سیاستداں خواہ وہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں اردو سے متعلق صرف وعدے کرتے ہیں۔ الیکشن قریب آنے پر اردو کی زبوں حالی اور اردو کو زندہ رکھنے کے لیے لچھے دار تقریریں کرتے ہیں اور الیکشن جیت کر اسمبلی و پارلیمنٹ میں جاتے ہیں تو وہاں اردو کے ساتھ ہو رہی ناانصافی کے خلاف ایک لفظ نہیں بولتے۔ آج اردو زبان وتہذیب کی جڑیں مکاتب، مدارس اور اخبارات و رسائل سے مستحکم ہیں۔ انھوں نے محبان اردو سے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو عصری علوم کے ساتھ ساتھ اردو زبان پڑھانے پر بھی خاص توجہ دیں۔ گھر میں اردو بول چال، اخبارات و رسائل و جرائد پڑھنے کا ماحول بنائیں، خود خرید کر پڑھیں اور دوسروں کو بھی خرید کر پڑھنے کی تلقین کریں۔ ہمیں آج کے اس پر آشوب دور میں اردو پڑھاؤ مہم کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● مالیر کوٹلہ۔ 15 جولائی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے پنجاب کے تاریخی شہر مالیر کوٹلہ کے گورنمنٹ کالج کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو میں قائم کیے گئے اردو تعلیمی مرکز میں ایک اہم تقریب منعقد کی گئی جس میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال نے مہمان خصوصی کا حاضرین سے تعارف کراتے ہوئے شعبۂ اردو کی نمایاں حصولیابیوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو اسٹڈی سینٹر میں چنڈی گڑھ کے علاوہ پنجاب اور ہریانہ کے مختلف شہروں سے انگریزی اور ہندی میڈیم سے اردو ڈپلوما کرنے والے 73 طلبہ داخل ہوئے ہیں جن میں اعلیٰ سرکاری حکام، اساتذہ، صحافی اور زندگی کے مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے ڈپلوما کے زیر تعلیم طلبہ سے کہا کہ وہ صرف ڈپلوما حاصل کرنے تک ہی اپنے آپ کو محدود نہ کریں بلکہ ان اقدار کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں جن کے لیے اردو زبان پوری دنیا میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زبان پر کسی خاص فرقے یا مذہب کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ زبانوں کا تعلق تمام انسانوں سے ہوتا ہے۔ اردو انسانیت کی زبان ہے اور اس نے انسانی استحصال، جبر و ظلم اور غلامی کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔ شعبۂ اردو کے سینئر استاد ڈاکٹر منظور حسن نے تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 22 جولائی، ذرائع ابلاغ و ترسیل صرف واقعات سے مطلع کرنے کا نام نہیں بلکہ اگر کامیاب ترسیل ہے تو ذہن وفکر کے زاویے کو بدل دیتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر وارث احمد نے کیا۔ وہ اردو پریس کلب کے زیر اہتمام نہرو گیسٹ ہاؤس جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقدہ ''ایک ملاقات'' میں خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو پریس کلب ایک مہم ہے جس نے مختلف سوچ کے لوگوں کو جوڑا اور اردو کو ایک نئی زندگی دی۔ پروگرام کی صدارت ملک زادہ منظور نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ادب کی ترقی زبان کی ترقی نہیں کہی جاسکتی دینی جلسوں اور کبھی کبھی مشاعروں کے بینر ہندی میں لکھے جا رہے ہیں۔ ہندی سے مجھے بیر نہیں ہے لیکن اردو کا انحطاط ناقابلِ برداشت ہے۔ پروگرام میں بحیثیت مہمانِ خصوصی ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور پروفیسر اختر الواسع اور سعودیہ اردو ریڈیو سروس کے نائب انچارج جناب لئیق اللہ نے شرکت کی۔ جناب لئیق اللہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ مصر میں زبان کے حوالے سے تو نہیں ادب کے حوالے سے کام ہو رہا ہے۔ اقبال اور ہندوستان کے تمام بڑے شعرا کے کلام کو عربی میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ قاہرہ، ازہر اور اسکندریہ یونیورسٹی میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ مصر کے طلبہ ایم.فل.، پی.ایچ.ڈی. اور ایم.اے. کے لیے ہندو پاک کی دانشگاہوں کا رخ کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب پر بہت زیادہ اور زبان پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ آج مختلف مذاہب کے لوگوں کو جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پروگرام میں مختلف ادبی ہستیوں نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت وسیم راشد نے کی۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● گورکھپور۔ 20 جولائی، ''اردو پڑھاؤ تحریک'' کے ایک وفد نے ہمایوں پور شمالی علاقے کے چار غیر مسلم اسکولوں کا دورہ کیا اور اردو کی تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ یہ وفد سب سے پہلے بیچ پیڑوا میں واقع سوربھ ششو شکشا سدن پہنچا۔ اسکول کے پرنسپل مسٹر انل کمار نے بتایا کہ ان کے اسکول میں 240 بچے زیر تعلیم ہیں اور سبھی بچے اردو پڑھتے ہیں۔ ان 240 بچوں میں 150 بچے غیر مسلم اور 90 بچے مسلم ہیں۔ مسٹر کمار نے بتایا کہ اس اسکول کے کئی طلبہ نے انجینئرنگ وغیرہ کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اسکول کے منیجر مسٹر رام ولاس ہیں۔ بیچ پیڑوا میں واقع آشیش بال ودیا مندر جونیئر ہائی اسکول میں 120 بچے زیر تعلیم ہیں۔ اسکول کے پرنسپل نندو پرساد

نے بتایا کہ اسکول میں 30 مسلم بچے اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسکول کے منیجر ایس ایس لال شریواستو ہیں۔ اسکول میں اردو کی تعلیم کے لیے ایک ٹیچر کا انتظام کیا گیا ہے۔ اسکالرس ہوم پبلک اسکول کی پرنسپل مسز جینتی جیسوال نے بتایا کہ اسکول میں 450 بچے زیر تعلیم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ 50 مسلم اور 3 غیر مسلم بچے اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسکول میں ایک اردو ٹیچر کی تقرری کی گئی ہے۔ اسکول کے منیجر مسٹر اے کے جیسوال ہیں۔ ''اردو پڑھاؤ تحریک'' کے وفد نے سب سے آخر میں جینیس پبلک جونیئر ہائی اسکول کا دورہ کیا۔ اردو کی تعلیم کے بارے میں اسکول کی پرنسپل سومن شریواستو نے بتایا کہ ان کے یہاں 100 بچے زیر تعلیم ہیں جن میں سے 50 مسلم بچے اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں دو اردو ٹیچر بچوں کو اردو کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اسکول کے منیجر راکیش کمار شریواستو ہیں۔ اردو پڑھاؤ تحریک کے وفد میں ڈاکٹر عدیل اختر، محبوب سعید حارث، افروز احمد اور تحریک کے کنوینر ظفر زاہدی شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● علی گڑھ۔ 5 اگست، اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوی ایشن اتر پردیش اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کے علی گڑھ یونٹ کے زیر اہتمام اردو اور اردو اساتذہ کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کی غرض سے ایمبیسی ہوٹل میں ایک نشست کا انعقاد کیا گیا، حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ آج اردو اساتذہ کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا جارہا ہے، ذمے داران کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنا تو دور سننے کے بھی متحمل نہیں ہیں، اس صورت حال سے صرف اتحاد اور تنظیم ہی چھٹکارا دلاسکتی ہے۔ انھوں نے اردو طلبہ کی کم ہوتی ہوئی تعداد پر بھی شدید تشویش کا اظہار کیا۔ نسیم شاہد نے کہا کہ ہم اردو ٹیچرس کی کامیابی کا راز اسی زبان میں پوشیدہ ہے۔ ہم اس زبان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں بلکہ اردو زبان ہماری خدمت کر رہی ہے۔ انھوں نے تنظیم اور اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم متحد نہیں ہوں گے ہمیں اسی طرح اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانی ہوں گی۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری شکیل احمد نے کہا کہ ہمیں اپنے بھائیوں کا دکھ درد محسوس کرنا چاہیے، کب تک ہم شتر مرغ کی طرح اپنے کو جھوٹی تسلی دیتے رہیں گے، ہمیں اپنے جائز حقوق کے مطالبے کے لیے صحافت کا بھی سہارا لینا چاہیے۔ سینئر صحافی یاس دہلوی نے زبان کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ زبان میں ہی ہماری تہذیب وثقافت پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ایسوسی ایشن کے ذریعے ہفت روزہ نکالنے پر ذمے داران کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسے صرف اخبار نہ سمجھا جائے بلکہ مشن کی طرح نکالا جائے۔ جب کہ ڈاکٹر کامل نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ہم اپنے وقار کو پہچانیں اور اردو کے سچے سپاہی بن کر اس کے تحفظ میں لگ جائیں۔ جلسے کی نظامت عبدالقدیر خاں نے کی۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● شولاپور۔ علامہ اقبال صرف شاعر نہیں ایک عظیم مفکر بھی تھے۔ ہم صرف ان کی نظموں کو پڑھ کر سر دھنتے ہیں لیکن ان کی فکر کو کوئی نہیں اپناتا۔ اس خیال کا اظہار جناب انیس چشتی نے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام شولاپور میں منعقدہ ایک سیمینار میں کیا۔ انھوں نے علامہ اقبال اور اتحاد ملت وقوم' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال نہ صرف مسلمانوں کے اتحاد کے علمبردار تھے بلکہ غیر مسلم ہم وطنوں سے بھی اتحاد کے داعی تھے۔ ان کا ''ترانۂ ہندی'' اس کا گواہ ہے۔

دوسرے مقالہ نگار گلبرگہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عبدالحمید اکبر نے ''علامہ اقبال اور تصوف'' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال تصوف کے خلاف نہیں تھے۔ البتہ انھوں نے غیر شرعی تصوف کو غلط ٹھہرایا۔ انھوں نے علامہ اقبال کا یہ قول دہرایا کہ میں ایسے تصوف کا مخالف ہوں جو حرکت اور فعالیت سے روکتا ہے اور جس کی اصل غیر اسلامی اور رہبانی ہے۔ اسلام رہبانیت نہیں ہے اور تصوف محض فلسفہ نہیں ہے معیار اخلاق بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کو اقبال بنانے میں مولانا جلال الدین رومی کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی شاعری میں مولانا رومی کے افکار جھلکتے ہیں۔ سیمینار کا آغاز قاری عیسیٰ فردوسی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ سیمینار کا افتتاح ایڈوکیٹ عمر خان بیریا نے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کی وطن دوستی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اقبال کی کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں انھوں نے ہندو مسلم یکجہتی اور حب الوطنی کی تلقین کی ہے۔

اس جلسے کی صدارت سابق رُکن اردو اکادمی ڈاکٹر عبدالعزیز نداف نے کی۔ جناب نعیم شیخ صدر یونین ایجوکیشن سوسائٹی بطور مہمان خصوصی شریک تھے۔ سیمینار کے کنوینر اور رکن اکادمی جناب وقار احمد شیخ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ انھوں نے اکادمی کے سالانہ بجٹ کو ناکافی کہا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ بجٹ میں خاطر خواہ اضافہ کرکے اردو دوستی کا ثبوت دے۔ سیمینار کی نظامت مولانا ابوالکلام آفاق نے کی اور مہمانوں کا تعارف ڈاکٹر غلام دستگیر شیخ اور پروفیسر عبدالرزاق رند نے کرایا۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 2 اگست، اردو کے معروف شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز نے موجودہ اردو صحافت کے معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت ادب کا ایک حصہ ہے۔ اردو صحافت کا مطلب صرف خبر دینا نہیں بلکہ بات کو دلوں میں اتارنا بھی ہے۔ موجودہ اردو زبان میں باہر کے اثرات آگئے ہیں اور صناعیت نے جگہ لے لی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے نئی دہلی میں آل انڈیا تنظیم علمائے حق کے دفتر میں ایک ادبی وشعری نشست میں کیا۔ اس موقعے پر صحافیوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر کلیم عاجز نے کہا کہ اردو محبت کی زبان ہے جو لذت محبت میں ہے وہی اردو میں ہے لیکن آج خود اردو والے

ہی اسے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ علامہ اقبال اور غالب کا الگ الگ میدان ہے۔ شاعری کے اعتبار سے غالب کا مقام بلاشبہ اونچا ہے جب کہ شعروشاعری میں اقبال ان سے آگے ہیں۔ اقبال آج صرف مجلسوں کی نذر ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے اردو زبان کے مستقبل پر برجستہ جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں جو مسلمانوں کا مستقبل ہے وہی اردو زبان کا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ شاعری پر قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ شاعری شاعری نہیں ہے۔ شاعری کا سرچشمہ زندگی ہے جو شاعری زندگی سے پھوٹتی ہے وہ اصل شاعری ہے۔ زندگی اگر جھوٹی اور صناعتی ہے تو شاعری بھی ویسی ہی ہوگی۔ میر کا لہجہ اختیار کرنے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جس درد وغم سے میں آشنا ہوا ہوں اسی سے میر بھی ہوئے تھے لیکن میں براہ راست آشنا ہوا ہوں جب کہ میر سے پہلے راسخ عظیم آبادی نے اس لہجے میں اشعار کہے ہیں۔ اس سے قبل ڈاکٹر کلیم عاجز نے اپنے مخصوص درد بھرے لہجے میں یہ غزل بھی پیش کی 'عشق کے غم زدوں سے ہم سفری میری ہے— یہ سبب ہے کہ غزل درد بھری میری ہے' اس موقعے پر تنظیم کے جنرل سکریٹری مولانا اعجاز عرفی کے علاوہ نقاد حقانی القاسمی، معین شاداب، محمد آصف انور، نعمان قیصر اور عابد انور کے علاوہ مختلف سماجی کارکن ڈاکٹر ذوالفقار، نسیم احمد و دیگر شرکا موجود تھے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

● جمشید پور۔ 4 اگست، حکومت جھارکھنڈ کی جانب سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے اعلان کے باوجود اس کے ساتھ تعصبانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے جس کے عملی طور پر نفاذ کے لیے ہماری لڑائی جاری رہے گی۔ اس کا اعلان سیکولر سوشل آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر نصر فردوسی نے تنظیم کے ایک خصوصی اجلاس میں کیا، جس میں تنظیم کے کارکنان و ممبران شامل ہوئے۔ جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے پرائمری اسکولوں کے ٹیچروں کی بحالی کے لیے ہونے والے امتحانات میں علاقائی زبان کی شکل میں سنتھالی، کورمالی، بنگلہ اور دیگر زبانوں کو لازمی پرچے کی شکل میں وزارت تعلیم کے ذریعے اعلان کیا گیا ہے، جو کہ اردو جاننے والے یا اردو میڈیم سے پڑھے ہوئے امیدواروں کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ غور طلب ہے کہ وزیر تعلیم شری بندھو ترکی کی طرف سے اس بات کی یقین دہانی پہلے ہی کرائی جا چکی ہے کہ اردو زبان والے امیدواروں کو علاقائی زبان کی حیثیت سے اردو کے امتحان دینے کی اجازت دی جائے گی۔ باوجود اس کے اڈمٹ کارڈ پر اردو کا کہیں نام و نشان نہ ہونے کی وجہ سے اقلیتی فرقے میں بہت زیادہ غم وغصے کا ماحول ہے۔ (اخبار مشرق، دہلی)

● لکھنؤ۔ 21 جولائی، اتر پردیش کے یونیورسٹی اور کالجز کے اردو ٹیچروں کی ایک اہم میٹنگ میں یہاں اتفاق رائے سے یونیورسٹی اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ ایسوسی ایشن کے قواعد وضوابط ترتیب دینے کے لیے ایک پانچ رکنی کمیٹی بنائی گئی جس میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو کوارڈی نیٹر بنایا گیا ہے۔ میٹنگ میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ریاستی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے ادارے بے اثر ہو چکے ہیں انھیں فعال بنایا جائے اور ان کی بجٹ میں اضافہ کیا جائے جن میں یوپی اردو اکادمی، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، اردو اڈوائزری بورڈ اور ڈائرکٹوریٹ آف اردو شامل ہیں۔ یوپی یونیورسٹیز کی ایکزیکیوٹیو کمیٹی، بیسک ششکشا پریشد، مادھیمک ششکشا پریشد اور ہائر ایجوکیشن کمیشن اور دیگر اساتذہ کو بھی بطور ممبر نامزد کیا جائے۔ پی سی ایس (جے) میں اردو کو پھر سے بحال کیا جائے۔ ریاستی سرکار کے محکموں نیز اسکولوں اور کالجوں میں اردو اسامیاں جلد از جلد پُر کی جائیں۔ ہر سطح پر اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے اور اردو اخبارات ورسائل کو اشتہارات کے لیے مختص رقم دیا جانا یقینی بنایا جائے۔ میٹنگ میں ڈاکٹر رضی الرحمٰن، ڈاکٹر شاہینہ رضوی، ڈاکٹر سلیم احمد، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر نسرین بیگم، ڈاکٹر مصباح الاسلام اور دوسروں نے شرکت کی۔

(اخبار مشرق، دہلی)

● سنبھل۔ 17 جولائی، آج مسلمانوں میں تعلیم اور اردو زبان کے فروغ کی اشد ضرورت ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا وہ طبقہ جو اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے قاصر ہے یا جو والدین اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم اس لیے نہیں دلا پاتے کیونکہ اردو روٹی روزی نہیں دلا سکتی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی نسل کو اردو زبان کی شیرینی و لطافت اور تاریخ سے محروم نہ رکھیں بلکہ اپنے گھر پر ہی ان بچوں کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کریں تاکہ کل یہ بچے بڑے ہو کر اپنے بزرگوں کے کارناموں اور مذہبی کتب کا مطالعہ کر سکیں اگر ہم سنجیدہ نہیں ہوئے اور اسی طرح اردو کو فراموش کرتے رہے تو کل ان بچوں کا تاریخ سے نابلد ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ان خیالات کا اظہار شان عالم خاں نے محلہ فتح اللہ سرائے میں مان سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک اجلاس میں کیا۔ پروگرام میں دیگر مقررین نے لڑکیوں کی تعلیم کو بھی اہم قرار دیا۔ ان مقررین میں محمد رئیس، ناظم خان، افروز عالم اور شاہ حسین عارف کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض محمد عاصم عثمانی نے انجام دیے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

● لکھنؤ۔ 28 جولائی، اردو بچاؤ تحریک کی میٹنگ مولوی عبدالخالق کی صدارت میں ہوئی اور نظامت ماسٹر معین الدین نے کی۔ میٹنگ میں تجویز پاس کر کے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ حکومت بلا تاخیر اردو کو آٹھویں درجے تک لازمی قرار دینے کا اعلان کرے۔ 1997 تک کے معلم اردو سند یافتگان کو اردو ٹیچر کے عہدے پر تقرری پانے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرے، اردو مترجمین کی بھرتی مہم چلا کر کی جائے، پی سی ایس جے میں پہلے کی طرح ایک

پرچہ اردو کے امتحان کا بحال کیا جائے، اس سے انصاف میں شفافیت آئے گی۔ ہر ضلع کے گورنمنٹ انٹر کالجوں میں انٹر کی سطح تک اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور سبھی پرائمری اسکولوں میں اردو کی کتابیں مفت مہیا کرائی جائیں۔ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے ماسٹر ارشاد احمد نے کہا کہ اتر پردیش اردو کا گہوارہ ہے، یہاں پرائمری سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام بھی اسی طرح حکومت کو کرنا چاہیے جس طرح ہندی اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● ترواننت پورم۔ 30 جولائی، سی پی ایم کی قیادت والی کیرالہ کی ایل ڈی ایف حکومت نے مدارس کے اساتذہ کے لیے پنشن سمیت کئی فلاحی اسکیموں کا آج اعلان کیا۔ کابینہ کی میٹنگ کے بعد پریس کانفرنس میں وزیر اعلیٰ وی ایس اچیوتانند نے کہا کہ کابینہ نے مدرسوں کے اساتذہ کو پنشن دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وقف بورڈ مدرسہ اور ٹیچر خود اس اسکیم کے لیے مشترکہ طور پر تعاون دیں گے۔ یہ فیصلہ مقامی ایڈمنسٹریٹو سکریٹری پی محمد کی سربراہی والی کمیٹی کی سفارشوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 5 اگست، اردو کی نئی بستیوں میں جن شخصیات نے اردو ادب کی بے لوث خدمات انجام دی ہیں ان میں سید عاشور کاظمی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے شعر و ادب میں ہی نہیں تحقیق میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو اکادمی، دہلی کے دفتر میں سید عاشور کاظمی کے اعزاز میں منعقد ایک تقریب میں وائس چیئرمین اردو اکادمی پروفیسر قمر رئیس نے کیا۔ سید محمود نقوی نے سید عاشور کاظمی کی تصنیف ''اردو مرثیہ کا سفر'' کو ایک کارنامہ قرار دیا۔ سید شریف الحسن نقوی نے بھی ان کے اس کارنامے کی ستائش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ وہ مستقبل میں بھی اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ سید عاشور کاظمی نے ''اردو مرثیہ کا سفر'' کتاب کے تعلق سے اپنے تجربات بیان کیے اور بتایا کہ وہ کس طرح اس کی جانب راغب ہوئے۔ انھوں نے برطانیہ میں اردو سے متعلق اپنی دیگر سرگرمیوں کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا کہ ترقی پسند تحریک کی ڈائمنڈ جوبلی جلد ہی لندن میں منائی جائے گی۔ اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا جب کہ نظامت انیس اعظمی نے کی۔ اس موقع پر ایک شعری نشست کا بھی انعقاد کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● پونے۔ 9 جولائی، اردو ساہتیہ پریشد کی ایک میٹنگ اردو ساہتیہ پریشد کے مرکزی دفتر پونے میں اردو پریشد کے نائب صدر معروف افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد کی صدارت میں ہوئی۔ چند ماہ قبل مہاراشٹر بھر سے مدعو اردو شعرا اور ادبا کی موجودگی میں ایک کل مہاراشٹر ایڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جن میں سے بیشتر ممبران کے تعاون سے صوبے بھر میں زائد از ایک ہزار کی ممبر سازی مکمل ہو چکی ہے۔ آج کی خصوصی میٹنگ میں مہاراشٹر کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اہم نمائندگان دربھنگہ سے ڈاکٹر محبوب راہی، مراٹھواڑہ سے سراج شولاپوری، دھولیہ سے ڈاکٹر شجاعت علی قادری ناندیڑ سے فیروز رشید، عثمان آباد سے نعیم سید، شولاپور سے بشیر پرواز، ہنگولی سے آصف اقبال، نیز پونہ سے لطیف جوڈیکر، عالم فتح پوری اور سید آصف سکریٹری ساہتیہ پریشد کی موجودگی میں سابقہ کارگزاری کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لیے درج ذیل لائحہ عمل تیار کیا گیا:

1. ماہ اگست میں مہاراشٹر کی مستقل باڈی تشکیل دی جائے گی۔
2. ماہ ستمبر کے اوائل میں کل ہند نیز بین الاقوامی سطح پر باڈی کی تشکیل مکمل ہو جائے گی۔
3. ماہ ستمبر ہی میں اردو ساہتیہ پریشد کا ترجمان رسالہ (سہ ماہی) منظر عام پر آ جائے گا۔
4. ماہ نومبر 2008 میں اردو کا بین الاقوامی اجلاس پونے میں منعقد کیا جائے گا۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 12 جولائی، نیو ایج میڈیا اینڈ ریسرچ سینٹر کے دہلی آفس میں ''نیو ایج میڈیا سینٹر ڈاٹ کام newagemediacentre.com ویب سائٹ کا افتتاح سید محمد اشرف، انکم ٹیکس کمشنر، نئی دہلی نے کیا۔ مولانا قمر احمد اشرفی ٹرسٹی میڈیا سینٹر نے مہمانوں کا استقبال کیا اور منیجنگ ٹرسٹی مولانا خوشتر نورانی نے میڈیا سینٹر کی پیش رفت پر روشنی ڈالی نیز ڈاکٹر خواجہ اکرام نے ویب سائٹ کی تفصیلات بتاتے ہوئے مستقبل کے عزائم سے مہمانوں کو آگاہ کیا۔ ویب سائٹ کا افتتاح کرتے ہوئے سید محمد اشرف نے میڈیا سینٹر کے افراد کو مبارک باد پیش کی اور ان کی کوششوں کو سراہتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ اس سمت میں یہ ادارہ اور بھی مثبت اقدام کرے گا۔ پروفیسر اختر الواسع نے اسے وقت کی بڑی ضرورت بتایا اور کہا کہ میڈیا سینٹر بہت بڑا کام کر رہا ہے جسے بلاشبہ ہر جگہ سراہا جائے گا۔ مولانا یٰسین اختر نے ہم عصر میڈیا کی کجرویوں کی نشاندہی کرتے ہوئے میڈیا کی صالح قدروں کے فروغ کے لیے کام کرنے کا مشورہ دیا۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● حیدرآباد کے ممتاز شاعر و ادیب جناب شاغل ادیب کو آندھرا پردیش اردو اکادمی نے کارنامۂ حیات ایوارڈ سے نوازا ہے جو حضرت امجد حیدرآبادی کے نام سے موسوم ہے اور 25 ہزار روپئے پر مشتمل ہے۔ شاغل ادیب گذشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے اردو شعر و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور بارہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سات شعری مجموعے اور پانچ نثری مجموعے شامل ہیں۔ (ڈاک سے)

● رتناگری۔ 12 جولائی، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی اور مستری

ہائی اسکول رتناگری کے اشتراک سے ''اردو کا سیکولر مزاج'' کے موضوع پر 12 جولائی 2008 کو ایک سیمینار اور شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی اور جناب ٹھاکر دیسائی بطور مہمان خصوصی شریک رہے۔

پروگرام کا آغاز مستری ہائی اسکول کے طلبہ و طالبات کی حمد، نعت اور مہمانوں کے استقبالیہ سے ہوا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی، شمیم عباس، یعقوب راہی اور وقار قادری نے ''اردو کا سیکولر مزاج'' کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اکادمی کی موجودہ کارکردگی اور آئندہ کے منصوبوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور کہا کہ اردو کا مزاج ہمیشہ سے سیکولر رہا ہے۔ اردو میں رامائن اور مہابھارت کے تراجم بڑی تعداد میں موجود ہیں جس سے اس زبان کے سیکولر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ بعد ازاں یعقوب راہی کی صدارت میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں قاضی فراز احمد، شمیم عباس، مغل اقبال اختر، پرویز باغی، رفیق وستا، سراج خان، اعجاز خان، سید معین، رضوان کاریگر، نے اپنا کلام پیش کیا۔ محترمہ شاذیہ سمیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد۔ ادارہ اردو تحریک، حیدرآباد کے زیر اہتمام ''ایک شام حیدرآباد کے استاد و بزرگ شعرا کے نام'' تلگو یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت جناب سلیم ساحل صدر ادارہ نے کی۔ سید نورالدین علی عابد نے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر صبغت اللہ شریف نے جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے کی صدارت جناب ناصر کرنولی نے کی۔ جناب سعداللہ خان سہیل ناظم تھے۔ مشاعرے میں ناصر کرنولی، صلاح الدین نیر، مضطر مجاز، مصحف اقبال توصیفی، اثر غوری، فیض الحسن خیال، شاغل ادیب، محسن جلگانوی، ستار صدیقی، یوسف یکتا، مسعود عابد، محمود حسین اور ڈاکٹر حسن نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ اس یادگار تقریب میں تمام مدعو شعرا کی گل پوشی و شال پوشی کی گئی اور اسناد تہنیت پیش کی گئیں۔ اسٹیج پر ادارے کا جو نیا بینر لگایا گیا تھا اس پر تمام مدعو شعرا کی تصاویر پیش کی گئی تھیں۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی۔ 27 جولائی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اکیڈمک اسٹاف کالج کے زیر اہتمام شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر عبدل بسم اللہ اور نظامت عمیر منظر نے کی۔ پروفیسر شہناز انجم نے کلمات تشکر ادا کیے۔ منتخب اشعار پیش خدمت ہیں:

پڑا رہتا ہے ہر دم خوف کا سایہ رگ جاں پر
جسے ہم گھر سمجھتے ہیں وہ گھر اب تک نہیں آیا

پروفیسر خالد محمود

اور ہے بہتا ہے جو دریاؤں میں
وہ جو ہے تیغوں میں پانی اور ہے

ڈاکٹر تابش مہدی

کہاں کے بیج یہ کن مٹیوں میں بوتے ہیں
جدید کیسے تھے مابعد کے جدید ہیں کیا

ڈاکٹر شہپر رسول

دلوں کے فاصلے بڑھنے سے پہلے
یہ پل تعمیر ہونا چاہیے تھا

ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی

بہت سی آنکھیں لگی ہیں اور ایک خواب تیار ہو رہا ہے
حقیقتوں کے مقابلے کا نصاب تیار ہو رہا ہے

فرحت احساس

رفو کرتا ہوں لیکن کیا کروں اپنے مقدر کو
جنون عشق کی یہ چاک دامانی نہیں جاتی

ڈاکٹر عمران احمد عندلیب

آپ کو کیا دیا ہے اپنوں نے
جو گلہ دوسروں سے کرتے ہیں

عرشی نقوی

نہ دوستوں سے نہ غیروں کی دشمنی سے تھا
مرا مقابلہ خود اپنی ذات ہی سے تھا

مظفر حسن عالی

ذہن میں تو ہے، تری راہ گزر ہے میں ہوں
اب تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کنارہ ہوجائے

عمیر منظر

اس موقع پر عبدالوحید امیر دہلوی، پروفیسر عبدال بسم اللہ، ڈاکٹر شیونند یادو، ہیمنت کگرتی، جیتندر رشری واستو، درگار پرساد گپتا اور چندردیو یادو نے کویتائیں پیش کیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

کہانیاں سی سناتے رہے در و دیوار
اجالے چھنتے رہے رات بھر حجابوں سے

نصرت گوالیاری

● نئی دہلی۔ 10 اگست، انڈس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نوئیڈا کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ بہ عنوان ''ایک شام ڈاکٹر سمیع سیوانی کے نام'' منعقد ہوا۔ صدارت نصرت گوالیاری نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔

کنوینر طالب رام پوری نے مہمانوں اور شرکا کا استقبال کیا۔ درج ذیل شعرا نے کلام سنایا:

نصرت گوالیاری، فصیح اکمل، کمال جعفری، ڈاکٹر تابش مہدی، شہباز ندیم ضیائی، مولا بخش اسیر، رؤف رضا، ابرار کرت پوری، قمر سنبھلی، سید راشد حامدی، ملک زادہ جاوید، منیر ہمدم، جاوید مشیری، معین شاداب، ڈاکٹر کوثر مظہری، طالب رام پوری، سلیم شیرازی، مسرت انجم۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

چہرے پر جو داغ رہے ہیں اک اک کرکے کھولے گا
آئینے کی شان یہی ہے آئینہ سچ بولے گا
نشتر مظاہری

● سہارنپور۔ 3 اگست، مجاہد آزادی ظہور احمد ظہور اور بزرگ شاعر کوثر تسنیمی کی یاد میں "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے ایک شعری محفل کا انعقاد بلاسم پبلک اسکول میں کیا گیا جس کا اہتمام انجمن زندہ دلانِ سہارنپور کی جانب سے کیا گیا۔ انجمن کے صدر آصف شمسی اور جنرل سکریٹری رحمٰن عزیز نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس محفل سخن کی صدارت کہنہ مشق شاعر مولانا نشتر مظاہری نے اور سرپرستی بزرگ شاعر عبدالرحمٰن شوق مانوی نے کی۔ نظامت ارشد ندیم کرتپوری نے کی۔ دیر شب تک جاری اس شعری محفل میں شہر کے معروف شعرا کے علاوہ باذوق سامعین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مندرجہ شعرا نے کلام سنایا:

شوق مانوی، جمیل مانوی، اکمل امام، فیاض ندیم، سریش سین، عاصم پیرزادہ، شاہ فیصل، شاہد زبیری، مسرور اجمل، خرم سلطان، اشتیاق عالم، دانش کمال، انوار ادیب غفار سیفی اور سدھیر پرواز۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

باتوں کا زخم ہے یہ کبھی بھر نہ پائے گا
جتنا بھی آپ زخم پہ مرہم لگائیے
قلم بجنوری

● نئی دہلی۔ 20 جولائی، انجمن فروغ اردو کی جانب سے جعفر آباد دہلی میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معین اختر انصاری اور نظامت قاری حسنین نے کی جب کہ مشاعرے کی شمع حافظ محمد سلیم اور قوی ایکتا کی شمع ایم کے راجپوت نے روشن کی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر وید سنگھ ملک، طارق صدیقی، ڈاکٹر پرویز میاں، مولانا محمد سلیمان، خلیفہ برکت پہلوان نے شرکت کی۔ شعرا تھے:

سیف سحری، ناشر کاظمی، شہادت علی نظامی، نثار دہلوی، ماسٹر نثار احمد، درد دہلوی، نعیم بدایونی، ثاقب گنگوہی، قلم بجنوری، مطرب جارچوی، ڈاکٹر راہی نظامی، راحت مظاہری، انداز دہلوی، قاری حسنین، کلیم جاوید، رام اوتار جمال، صوفی شمیم، طرب چندوسی، ناصر بھاگوالوی، انور غازی آبادی، واحد دہلوی، جتیندر پرواز، اسرار سرونی، عاصم کرتپوری، عاقل گوہر محمود آبادی اور سلیم پلکھوی۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

دل میں ترے خیال کی خوشبو ہے آج بھی
سب جاچکے یہاں سے مگر تو ہے آج بھی
فاخر ادیب

● بجنور۔ 20 جولائی، معروف شاعر آنجہانی رام کمار ور ماغم بجنوری کی چھٹی برسی پر مسلم گرلز ہائر سیکنڈری اسکول میں ایک شعری محفل کا انعقاد کیا گیا جس میں حاضرین نے غم صاحب کے فن اور شخصیت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ادبی انجمن "مشعل راہ اردو فورم" کی جانب سے منعقدہ محفل میں شعرا اور کوی حضرات نے آنجہانی غم بجنوری کو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت جناب زاہد حسین ٹھیکیدار نے فرمائی۔ جبکہ نظامت کے فرائض فاخر ادیب نے انجام دیے۔ شمع افروزی کی رسم مہمان خصوصی جناب ایس جے آر نقوی نے ادا کی جبکہ مہمان ذی وقار بجنور انٹر کالج بجنور کے کنٹرولر جناب اقبال احمد خاں تھے۔

شعری محفل کا آغاز جناب مقصود نگینوی اور شفق بجنوری نے نعت پاک پیش کرکے کیا، بعدۂ بہاریہ دور شروع ہوا۔ اس کے بعد ان شعرا نے اپنا کلام پڑھا:

ریاض بجنوری، فاروق بجنوری، فاخر ادیب، منصور بجنوری، امیر نہٹوری، شفق بجنوری، مقصود نگینوی، انور رئیس اور آزاد بجنوری۔ (صحافت، دہلی)

تقریب

"اردو مرثیے کا سفر"

● نئی دہلی۔ یکم اگست، اردو کی آبادیوں سے ہزاروں میل دور یوروپ میں رہ کر بھی اپنی تہذیب و ثقافت سے رشتہ جوڑے رکھنا اور "اردو مرثیے کا سفر" تصنیف کرنا ایک بہت مشکل کام تھا جسے سید عاشور کاظمی نے انجام دیا۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو گھر میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام سید عاشور کاظمی کی کتاب "اردو مرثیے کا سفر" کی رسم اجرا کے موقع پر مقررین نے کیا۔ جلسے کی صدارت سید حامد نے کی۔ کتاب کا اجرا ترکمانستان میں ہندوستان کے سفیر م افضل نے کیا۔ دیگر مہمانانِ ذی وقار میں پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی شامل تھے۔ نظامت وسیم راشد نے کی جبکہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اظہار تشکر کیا۔ کتاب کے مصنف سید عاشور کاظمی نے اس موقع پر موجود تمام افراد کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

"اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857"

● نئی دہلی۔ 3 اگست، نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری کے مطابق 1857 کی تاریخ بھی 1947 کی تاریخ کی طرح نامکمل ہے لیکن جو بات مکمل

طور پر کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی کی اردو اخبارات نے بھرپور حمایت کی تھی۔ جناب انصاری نے یہاں اپنی رہائش گاہ پر "اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857" کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کا اب وہ کردار نہیں رہا جو پہلے تھا۔ جیسا کہ دوسری زبانوں کی رسائی کا دائرہ کافی وسیع ہوا ہے، لہٰذا اب یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہے کہ اردو کی عام رسائی کیوں نہیں ہے۔ معصوم مرادآبادی کی اس تحقیقی کاوش کی انھوں نے ستائش کی اور کہا کہ صحافت صرف ایک صنعت اور ایک ذریعۂ معاش کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک جذبے کا نام بھی ہے اور یہ کتاب اسی جذبے کی ترجمانی کرتی ہے۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے مصنف کی کوشش کو سراہتے ہوئے کہا کہ معصوم مرادآبادی اس روایت کے امین ہیں جو سرسید سے شروع ہو کر حیات اللہ انصاری وغیرہ تک پہنچی۔ انھوں نے کہا کہ اپنی کتاب میں معصوم مرادآبادی نے اردو صحافت کے اس عہد کے کئی بند ابواب کو کھولا ہے اور خصوصاً "پیام آزادی" سے متعلق انکشافات نے اس کتاب کو دستاویزی حیثیت عطا کی ہے اور جنگ آزادی کے اولین شہید صحافی مولوی محمد باقر کے کردار کو داغدار بنانے کی بے بنیاد اور مذموم کوشش کو بڑے مدلل طریقے سے ناکام بنایا گیا ہے۔ بزرگ صحافی کلدیپ نیر نے اپنے صحافتی کیریئر کے آغاز کے لیے اردو کے تئیں اظہار ممنونیت کیا۔ انھوں نے کہا کہ معصوم مرادآبادی نے اپنی کتاب میں صحافت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس دور کے حالات کا نقشہ بھی بڑی مہارت سے کھینچا ہے اور نئی نسل کو اپنے اجداد کی دیرینہ تہذیبی روایت سے بھی آگاہ کرایا ہے۔ معصوم مرادآبادی نے 1857 کی جنگ آزادی کے ڈیڑھ سو سال پورے ہونے کے جشن کے سال کو مولوی محمد باقر کے حوالے سے نقصان پہنچانے کی ایک انگریز مصنف کی ہتک آمیز کوشش کو اپنی اس تحقیق کا سبب بتاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ایک بے بنیاد اور شرانگیز الزام کو دلیلوں اور دستاویزی حوالوں سے دھونے کی کوشش کی ہے۔ اردو ہندی میں یکساں مقبول صحافی قربان علی نے کتاب کی اہمیت اور مصنف کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ معصوم مرادآبادی کی تاریخ جیسے خشک موضوع کو بڑے دل نشیں اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے ان کی کتاب کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ تقریب کے اہم شرکا میں پروفیسر ہاشم قدوائی، اسلم شیر خاں، سنتوش بھارتی، خواجہ محمد شاہد، گربچن چندن، ظفر آغا، دویا سبرانیم (روزنامہ ہندو)، سیما گپتا (آوٹ لک)، خواجہ عبدالخالق، حسن ضیا (مدیر روزگار سماچار)، خورشید اکرم (مدیر آجکل) انجم عثمانی (دوردرشن) محمد احمد کاظمی (میڈیا اسٹار) وسیم احمد، عمران قدوائی، ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعدد نمائندوں نے شرکت کی۔ (صحافت، دہلی)

"گاہے گاہے"

● ممبئی۔ 26 جولائی، اعتراف گروپ ممبئی کے زیر اہتمام مشہور شاعر سعید راہی کے مجموعۂ کلام "گاہے گاہے" کی رسم اجرا 26 جولائی 2008 کی شام اکبر پیر بھائی ہال، سی. ایس. ٹی ممبئی میں محترمہ ریحانہ آندرے کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر عبداللہ شیخ اور ڈاکٹر مصطفےٰ پنجابی بطور مہمان خصوصی شریک رہے۔

سعید راہی کے فن اور شخصیت پر عبدالاحد ساز، پروفیسر ظہیر علی، ساجد رشید، پروفیسر منور علی، ڈاکٹر قاسم امام اور وقار قادری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سعید راہی نے اپنے ادبی سفر کی کچھ یادیں بیان کیں اور اپنی کئی غزلیں اور گیت سنائے:

تم نہیں، غم نہیں، شراب نہیں
ایسی تنہائی کا جواب نہیں
گاہے گاہے اسے پڑھا کیجیے
دل سے بہتر کوئی کتاب نہیں
تیری یاد میں تنہا بیٹھے کیا کیا کھیل کیے ہم نے
چُن چُن جیب میں ڈالے موتی پھینک دیے ہم نے

(ڈاک سے)

"رہنمائے قوافی"

● نئی دہلی۔ 20 جولائی، انجمن فروغ اردو کے زیر اہتمام تقریباً 6 ہزار قافیوں پر مشتمل درد دہلوی کی تازہ تصنیف "رہنمائے قوافی" کا اجرا محمد حسین انصاری اور ایم کے راجپوت کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ معین اختر انصاری نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب کے اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ مرزا شاہد چنگیزی اور ڈاکٹر فہیم بیگ نے کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب شعرا کی ایک ایسی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ ہے جو ہر شاعر کو تازہ کلام کہتے ہوئے پیش آتی ہے۔ بعد میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں تقریباً تیس شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

"رہبر اعظم"

● پانی پت۔ 3 اگست، محسن انسانیت حضرت محمدؐ کے حوالے سے کچھ کہنے یا لکھنے کے لیے بڑے ثبوتوں کی ضرورت ہے، اسی لیے آقا نے پہلے ہی فرما رکھا ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کرے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ خاص طور پر منظوم کلام میں آپ کی عادات و صفات

کے بیان میں تو مزید احتیاط درکار ہے۔ ان خیالات کا اظہار مدرسہ غوثیہ کے صدرالمدرسین مولانا عرفان قاسمی نے کیا۔ موصوف حکیم حافظ محمد اعظم کی کتابوں "رہبر اعظم" اور "محسن اعظم" کے اجرا کے موقع پر خطاب کررہے تھے۔ واضح ہو کہ حافظ موصوف نے 78اور 56 صفحات پر مشتمل 2 منظوم کتابیں لکھی ہیں، ان کتابوں پر حافظ پیر جی حسین احمد سمیت متعدد اہل علم کی تقاریظ ہیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

وفیات

الیگزنڈر سولنسٹین

● ماسکو۔ 3اگست، "کینسر وارڈ" اور "گلاک مجمع الجزائر" جیسی شہرۂ آفاق کتابوں کے مصنف الیگزنڈر سولنسٹین کا 3اگست 2008 کو ماسکو میں انتقال ہوگیا ان کی ان دونوں کتابوں کا ترجمہ دنیا کی دوسری کئی زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی ہوا ہے۔

سولنسٹین نے لمبی عمر پائی۔ انتقال کے وقت وہ 89 سال کے تھے۔ اسٹالن کی موت کے بعد روس میں آزاد خیالی کی جو لہر آئی تھی اور سخت گیر اشتراکی نظام کے خلاف جو آوازیں اٹھنا شروع ہوئی تھیں، سولنسٹین کی آواز ان میں سب سے طاقتور تھی۔ ان کی ادبی شہرت کا آغاز ان کے ناول "آئیوان ڈینسووچ کی زندگی کا ایک دن" کی اشاعت کے ساتھ ہوا جو 1962 میں شائع ہوا۔ ان کا ناول "کینسر وارڈ" 1968 میں شائع ہوا جس نے انھیں عالم گیر شہرت عطا کی۔ 1970 میں انھیں ادب کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ 1974 میں ان کے سیاسی خیالات کی پاداش میں انھیں جلاوطن کردیا گیا تھا۔ بیس سال جلاوطنی کی زندگی گزار کے 1994 میں وہ روس واپس چلے گئے تھے۔ روس کے موجودہ حالات سے بھی وہ مطمئن نہیں تھے اور روسی سماج میں جو نئی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کے شاکی تھے۔

چیتن داتار

● ممبئی۔ 2اگست، مراٹھی ڈراما ابھی نامور ڈرامہ نگار وجے تینڈولکر کی وفات کے غم سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ مراٹھی کے نوجوان ڈراما نگار و ہدایت کار چیتن داتار 2اگست کو 45 سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد گزر گئے۔ وہ مراٹھی کے تجزیاتی ڈراموں کے اہم ادارے "اوشکار" کے جنرل سکریٹری تھے اور وجے تینڈولکر صدر ہوا کرتے تھے۔

گذشتہ دس برسوں سے چیتن داتا کی مراٹھی تھیٹر سے کل وابستگی رہی تھی۔ ان کے اہم ڈراموں میں "سانولیا"، "ایک مادھو باغ"، "اندھیرا"، "ڈونگاجی ہاؤس"، "چندرپور چا جنگلات" اور "دستک" بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان، اردو شاعری اور اردو سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ انھوں نے سعادت حسن منٹو کی کہانیوں پر مبنی ڈراما "منٹو نامہ" اور انتظار حسین کی کہانی "مورنامہ" کو اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ "مورنامہ" نیوکلیئر دھاکوں کے خلاف ایک احتجاجی کہانی ہے۔ انھوں نے عراق پر امریکی حملے کے بعد "عراق" کے عنوان سے بھی ایک ڈراما پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر جلال انجم

● نئی دہلی۔ دہلی کی فعال اور سرگرم ادبی شخصیت ڈاکٹر جلال انجم کا 28جولائی کو شام تقریباً ساڑھے پانچ بجے انتقال ہوگیا۔ وہ ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن دہلی سرکار میں ملازم تھے اور انھیں اردو اکادمی کے بیسٹ اردو ٹیچر کے ایوارڈ سے نوازا جاچکا تھا۔ ان کی تین تصانیف افکار تازہ (تنقیدی مضامین)، "اردو غزل بیسویں صدی کے تناظر میں" اور "قلق میرٹھی، حیات اور کارنامے" (تحقیقی مقالہ) منظرعام پر آچکی ہیں اور مزید کئی کتابیں زیر ترتیب تھیں۔ انھیں 29جولائی کو جامعہ نگر کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ وہ ایک شریف النفس اور وضعدار انسان تھے اور درس وتدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اے.ایم.کوثر

● ٹونک۔ گذشتہ دنوں جناب اے.ایم.کوثر جن کا اصل نام امیر محمد خاں تھا، اپنے آبائی وطن ٹونک میں انتقال کرگئے۔ انھیں پچھلے ایک سال سے کینسر کا عارضہ لاحق تھا۔ درمیان میں مرض کی شدت کم ہوگئی تھی لیکن پھر عود کرآئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 73 سال تھی۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں، دونوں بیویوں سے اولادیں ہیں۔

کوثر صاحب کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ راجستھان میں خاتمۂ زمینداری کا قانون نافذ ہونے کے بعد وہ دلّی چلے آئے تھے جہاں انھوں نے چند ماہ ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کی۔ پھر وہ واپس ٹونک چلے گئے اور سرکاری نوکری میں آگئے۔ شاعری میں انھیں صرف غزل سے شغف تھا، کم کہتے تھے مگر اچھا کہتے تھے۔ "اردو دنیا" کے اعزازی مدیر مخمور سعیدی کے وہ خالہ زاد بھائی تھے۔

□□□

تبصرہ وتعارف

● آزادی کے بعد اردو طنز ومزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 655، قیمت: 457 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: وسیم اقبال، محلہ قاضی سرائے اوّل، نگینہ ضلع بجنور، یو. پی.

اردو ادب میں طنز ومزاح کی جلوہ فرمائیاں ہمیں اس کے آغاز ہی سے نظر آتی ہیں۔ ابتدا میں یہ تصویر نہ تو پوری طرح واضح تھی اور نہ ہی فنی اعتبار سے پختہ۔ لیکن جس طرح اردو ادب مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا ہر موڑ پر اپنے اندر نئے نئے رنگ سمیٹتا رہا اسی طرح طنز ومزاح بھی نئی جہتوں سے روشناس ہوا۔ آزادی سے قبل طنز ومزاح کے موضوعات کا زیادہ تر تعلق ہندوستان پر انگریز حکومت اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات سے تھا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے نہیں گئے۔

آزادی کے بعد سماجی رویوں اور انسانی رشتوں میں تبدیلیوں نے انسان کی ذہنی اور جذباتی رو کو بھی بدلا۔ دولت ایک اہم عنصر کی حیثیت سے نمایاں ہوئی جس نے پوری دنیا کو تجارت زدہ Commercialised کر دیا۔ ہر چیز دولت کی کسوٹی پر پرکھی جانے لگی۔ ٹیکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کو گلوبل ولیج میں تبدیل کر دیا، جس کے نتیجے میں انسان کا زاویۂ نظر بدلا، آپسی رشتوں کے بنیادی عناصر متاثر ہوئے اور اخلاقی قدروں کا نظام تہس نہس ہو گیا اور یہ سب اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ طنز ومزاح نگاروں کے ہاتھ ایک زبردست میدان آ گیا۔ برطانوی اقتدار کے خاتمے سے جو راستہ بند ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ وسیع میدان اب مل گیا۔ ذاتی مفاد، خودغرضی، ریاکاری، تصنع اور ان جیسے بے شمار عوامل انسانی زندگی میں رچ بس گئے اور ایک قلم کار کو اچھا موقع مل گیا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ بس ضرورت عمیق مشاہدے، باریک نظری اور مثبت اندازِ فکر کی تھی اور عملاً یہی ہوا بھی۔ اس دور کی تخلیقات پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ پھکڑپن، ابتذال اور سطحیت جو قدما کے یہاں پائی جاتی تھی اب دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی جگہ گہرائی نے لے لی۔ انسان کی کوتاہیوں یا سماجی خامیوں پر اٹھنے والی تنقیدی نگاہ کے پیچھے تعمیری ذہن کام کرنے لگا اور وہ مثبت پہلوؤں کی ترجمان ہو گئی۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''آزادی کے بعد اردو طنز ومزاح'' کو پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کافی عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو موصوف نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر و معیاری طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے اس خوبصورتی کے ساتھ مزیّن کیا ہے کہ اس میں مزاحیہ ادب کے ذیل میں آنے والی ان تمام چیزوں کا احاطہ بھی ہو گیا ہے کہ جن کو کبھی طنز کبھی ظرافت اور کبھی استہزا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کی حدیں انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری وغیرہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں پاکستان چلے جانے والے ان طنز ومزاح نگاروں کے مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے جنھوں نے آزادی یا ملک کی تقسیم تک مزاحیہ اور طنزیہ ادبی سرمایے کی تشکیل میں حصہ لیا اور جن کی تحریروں کو ملک کی تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں اس حد تک مقبولیت حاصل ہوئی کہ نصابی کتب اور تنقیدی تاریخ میں برابر کی جگہ ملی مثلاً ابراہیم جلیس اور پطرس بخاری وغیرہ۔

اس کتاب کو قومی اردو کونسل نے ''بھارت بھارتی'' سیریز کے تحت شائع کیا ہے۔ اس سیریز کے تحت آزادی کے بعد کے اردو ادب کے انتخاب کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں اس خیال سے شائع کیا جا رہا ہے۔ تاکہ اس ملک کا بڑا طبقہ جو اردو رسم الخط نہیں جانتا وہ بھی اردو ادب سے لطف اندوز ہو سکے۔

یہ انتخاب آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے کہ جس کے حوالے سے اس کے ارتقائی منازل کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے دائیں جانب اردو متن دیا گیا ہے اور اس کے سامنے ہندی۔ مشکل الفاظ کے معنی بھی درج ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔ یہ ایک جامع کتاب ہے جو کم وبیش 25 مختلف نوع کے دلچسپ وخوش اسلوب مضامین سے مزین ہے امید کی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب نہ صرف مقبول خاص وعام ہوگی بلکہ علمی وادبی حلقوں میں بھی اس کی پذیرائی ہوگی۔

● اندر سبھا کی روایت

مصنف: پروفیسر محمد شاہد حسین

صفحات: 343، قیمت: 140 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: آصف اقبال، 352۔ای، منیرکا ولیج، نئی دہلی-67

تحقیق وتنقید میں پروفیسر محمد شاہد حسین — میڈیا، تھیئٹر (ڈراما) اور فلم سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ اس میدان میں ان کی کئی اہم تصانیف بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جن میں ''ابلاغیات'' کو اردو ماس میڈیا کے حلقے میں کافی شہرت ملی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''اندر سبھا کی روایت'' ان کی ایک ایسی تصنیف ہے جو تحقیقی زاویے سے قابلِ قدر تسلیم کی جائے گی۔ اس سے پہلے بھی ان کی ایک

اور کتاب ''ڈراما، فن اور روایت'' ادبی حلقوں میں ایک خاص مقام حاصل کر چکی ہے۔ ''اندر سبھا کی روایت'' کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ پہلی بار ''اندر سبھا'' کو ہندوستانی اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ شروع ہی سے اسے مغربی ڈرامے کے اصولوں پر پرکھا جا رہا تھا، جبکہ اس کی بنیاد خالص ہندوستانی اصولوں پر ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا اہم حصہ وہ ہے جس میں ''اندر سبھا'' کی ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ اسٹیج اور پیش کش کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے جس سے اکثر بے توجہی برتی گئی ہے، حالانکہ مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی کتاب ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' میں اسٹیج اور پیش کش کے نقطۂ نظر سے کچھ نکات اٹھائے ہیں لیکن جس شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب میں اندر سبھا کی روایت اور اس کی پیش کش اور بعد کے ڈراموں پر اندر سبھا کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے وہ صرف اس کتاب کا خاصہ ہے، جس کا اندازہ کتاب کے ابواب اور ذیلی عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے۔ ''اندر سبھا کی روایت'' درج ذیل تین ابواب پر مشتمل ہے:

1. اندر سبھا سے پہلے ہندوستانی ڈرامے کی روایات، 2. اندر سبھا کا تجزیہ
3. اندر سبھا کا اثر بعد کے ڈراموں پر

پہلے باب میں اندر سبھا سے پہلے کی ان ہندوستانی ڈرامائی روایات کا جائزہ لیا گیا ہے جو اندر سبھا امانت کی تشکیل پر کسی نہ کسی صورت میں اثر انداز ہوئیں۔ اس باب کے تین ذیلی حصے ہیں:

(الف) ''سنسکرت ڈرامے کی روایات'' اس کے تحت سنسکرت ڈرامے کے اہم اصول و روایات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

(ب) ''عوامی روایات کا تجزیہ'' اس باب کا کافی اہم حصہ ہے۔ اس میں اس عوامی روایت کا تجزیہ کیا گیا ہے جو اس وقت پورے ملک میں سنسکرت ڈرامے کے فنی، تکنیکی اور تخلیقی کمالات کی جگہ لے چکی تھی اور پورے ملک میں رقص و موسیقی کا دور دورہ تھا۔ اس عنوان کے تحت رام لیلا، راس لیلا، بہروپیا، بھنڈیتی، بھگت بازی، نقالی، کٹھ پتلی کا ناچ، داستان گوئی، مرثیہ خوانی اور مجرے کی محفلوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔

(ج) ''درباری ڈرامائی روایات کا تجزیہ'' اس کے تحت رادھا کنھیا کا قصہ، واجد علی شاہ کے رہس، ان کا پری خانہ، ان کی تین اسٹیج مثنویاں اور جوگیا میلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا باب بھی تین حصوں میں منقسم ہے:

(الف) ''اندر سبھا کا تجزیہ ادبی نقطۂ نظر سے'' اس میں اندر سبھا کا سنہ تصنیف، قصے کا ماخذ، پلاٹ، کردار اور اس کی زبان و بیان سے بحث کی گئی ہے۔

(ب) ''اندر سبھا کا فنی تجزیہ تھیٹر کے نقطۂ نظر سے'' اس کے تحت اندر سبھا کے اسٹیج اور پیش کش کے طریقۂ کار جس میں پردے کے استعمال، سین تبدیل کرنے کی تکنیک، لباس، آرائش اور رقص کی نوعیت سے بحث کی گئی ہے۔

(ج) ''اندر سبھا بحیثیت غنائیہ'' اس کے تحت اندر سبھا میں گانے اور موسیقی کی نوعیت، ان کا استعمال اور گانوں کی روایت پر نظر ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب کے بھی دو ضمنی موضوعات ہیں:

(الف) ''اندر سبھا کی روایت میں دوسری سبھائیں'' اس عنوان کے تحت یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اندر سبھا کے طرز پر کون کون سی سبھائیں لکھی گئیں۔ جن میں اندر سبھا مداری لال، بزم سلیمان اور جشن پرستان کا بطور خاص جائزہ لیا گیا ہے۔

(ب) ''پارسی اسٹیج پر اندر سبھا کے اثرات'' اس عنوان کے تحت خان صاحب نسرواں جی مہرواں جی آرام سے لے کر آغا حشر تک نمائندہ ڈراما نگاروں کے ڈراموں کا تجزیہ کیا گیا ہے تاکہ پارسی اسٹیج پر اندر سبھا کے اثرات کی نشاندہی بھی ہوسکے اور یہ بھی واضح ہوجائے کہ اندر سبھا کی روایت کب تک زندہ اور موثر رہی۔

مجموعی طور پر اس کتاب کے ذریعے یہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اندر سبھا اور اس کی قائم کردہ روایت ایک ایسی پرزور، پراثر اور فنی حیثیت سے پختہ روایت ہے جس کا سلسلۂ نسب سنسکرت ڈرامائی روایات سے جا ملتا ہے، جس نے ہندوستانی ڈرامائی روایات کی توسیع بھی کی ہے اور اس پر اضافہ بھی اور جس کی واضح اثر انگیزی تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ ''اندر سبھا کی روایت'' کی انھی خصوصیات کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنی اسکیم 'کلاسیکی موضوعات کی بازاشاعت' کے تحت حال ہی میں اسے شائع کیا ہے تاکہ طلبہ اور اساتذہ خاطر خواہ طور پر استفادہ کرسکیں۔

● فکر و تحقیق سہ ماہی (جولائی تا ستمبر 2008)

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید
مشیر: محمود سعیدی
صفحات: 160، قیمت: 25 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: سرفراز جاوید، A164، ہزارہ والی گلی، کرشن کالونی، چھیل چسف، دہلی۔7

سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' اردو کا ایک موقر جریدہ ہے۔ اس میں اکثر اردو کے ممتاز ترین علما و ادبا کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس شمارے میں بھی آٹھ مضامین شامل ہیں جن میں کئی ایسے ہیں جن کو واقعی اردو ادب میں اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ اس شمارے کا سب سے پہلا مضمون جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے جس میں فاروقی صاحب نے ایرانی فارسی کے مقابلے میں ہندوستانی فارسی اور اردو کے مراتب کے مسئلے سے بحث کی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ ابتدا میں ہندوستانی فارسی گو اپنے اوپر پورا اعتماد رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تاریخ کے کسی

موڑ پر ان کا وہ اعتماد جاتا رہا اور وہ سند کے لیے ایرانی علما کی طرف دیکھنے لگے اس سلسلے کی متعدد مثالیں انھوں نے اپنے مضمون میں پیش کی ہیں۔ دوسرا مضمون رفعت سروش نے میر تقی میر کی غیر عشقیہ مثنویوں پر لکھا ہے اس میں رفعت سروش نے مثنویات میر کے امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔ تیسرا مضمون فارسی کے اہم شاعر فرخی یزدی پر سید حسن عباس نے لکھا ہے اور چوتھا مضمون اقبال کے مغربی افکار پر ڈاکٹر ابوبکر عباد کا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اقبال کے تصور تہذیب وتمدن سے بحث کی ہے اور مشرقی اور مغربی تہذیب وتمدن کے حوالے سے اقبال کی نثری اور شعری تحریروں کا جائزہ لیا ہے۔ پانچواں مضمون جناب پردیپ جین کا ہے جس کا عنوان ''انصاف کا انصاف'' ہے۔ یہ پریم چند کے سلسلے کی تحریروں میں اہم اضافہ ہے۔ چھٹا مضمون ''امیر خسرو اور اردو شعریات'' جناب جاوید رحمانی کا ہے جس میں انھوں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ اردو شعریات پر اردو میں جو کتابیں اور مضامین لکھے گئے ان میں ہندوستانی فارسی مصادر سے استفادہ بالکل نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ابوالکلام قاسمی کی کتاب ''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایات'' میں بھی امیر خسرو کے دیباچۂ غرۃ الکمال کا حوالہ نہیں ملتا اور پھر دیباچۂ غرۃ الکمال کی بحثوں کا تعارف کرانے کے بعد یہ بتاتے ہیں کہ ہماری شعریات میں روانی اور ربط کو جو اتنی اہمیت دی گئی وہ امیر خسرو کے اسی دیباچے کا فیضان ہے۔ ساتواں مضمون جناب ابوالکلام کا ''ترجمہ لسانیات اور ثقافت'' ہے اس میں ترجمے کی ثقافتی اور لسانی دشواریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آٹھواں مضمون جناب جمشید احمد کا ''مجید امجد ایک منفرد نظم نگار'' ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجید امجد اردو کے بہت اہم نظم نگار ہیں لیکن ان کی نظم نگاری کا یہ مطالعہ تشنگی بڑھا دیتا ہے۔

● **منشورات بنگالہ: جلد اول انیسویں صدی**

مصنف: ڈاکٹر شہناز نبی

صفحات: 400، قیمت: 300 روپے

ناشر: عثمانیہ بک ڈپو، لور چیت پور روڈ، کولکاتا

مبصر: ظفر اللہ انصاری، 265، پیریار ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی-67

ڈاکٹر شہناز نبی کی کتاب ''منشورات بنگالہ'' دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں بنگال کی اردو نثر کی اجمالی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں سرزمین بنگال پر لکھی گئی چوبیس داستانوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ساٹھ صفحات کو محیط پہلے حصے کی نوعیت ایک تحقیقی مقالے کی ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات اس طرح ہیں: ''بنگال — تاریخ کے آئینے میں، بنگال میں مسلمانوں کی آمد، بنگال اور صوفیائے کرام، کلکتہ مدرسہ، فورٹ ولیم کالج، ابتدائی ادبی کوششیں، فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات، دینی رسائل اور بنگال میں اخبارات ورسائل کی اشاعت۔ ان تمام ذیلی عنوانات کی مدد سے مصنفہ نے بنگال میں اردو ادب کی ابتداء اور اس کے فروغ وارتقا کے خدوخال اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے حصے میں مصنفہ نے اردو ہی نہیں بلکہ انگریزی منابع سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان منابع کا تعلق ادب سے کم تاریخ سے زیادہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ پر بھی نگاہ رکھتی ہیں اور اردو کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی استفادے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ اس میں جن چوبیس داستانوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کی حیثیت محض انتخاب کی نہیں ہے۔ انھوں نے ان داستانوں کے اصل منابع اور ان سے متعلق تحقیقات کی ہے اور پھر اپنی تحقیقات کا حاصل پیش کیا ہے جو انھیں ایک باشعور محقق ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس کتاب کی محتویات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ (i) یہ کتاب سرزمین بنگال پر معرض وجود میں آنے والی تاریخ کا ایک حصہ ہے (ii) اس میں بنگال کی اردو نثر کی روایت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (iii) اس میں انیسویں صدی میں لکھی گئی داستانوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ (iv) داستانوں سے طویل اقتباسات پیش کیے گئے ہیں تاکہ اردو نثر کا ایک انتخاب بھی تیار ہو جائے اور (v) اس کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کا خاتمہ یہیں پر نہیں ہوتا بلکہ اس کی دوسری اور تیسری جلدوں کے ظہور میں آنے کا بھی امکان ہے۔

مذکورہ کتاب کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اس میں تمام نکات سمٹ آئے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایک اور نکتے کی طرف دھیان جاتا ہے اور وہ ہے اس کا اسلوب۔ میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ شہناز نبی صرف خوبصورت شاعری ہی نہیں کرتیں، پرلطف واثر انگیز نثر بھی لکھتی ہیں۔ ان کی نثر ان کی سلجھی ہوئی سمجھ کی ترجمان ہے۔

● **میں کوئی اور ہوں**

شاعرہ: ناز فاطمہ

صفحات: 228، قیمت: 160 روپے

ناشر: رحیم سینٹر پریس، فیصل آباد، پاکستان

مبصر: ڈاکٹر خواجہ اکرام، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو، نئی دہلی-67

ناز فاطمہ پاکستان کی نئی نسل کی شاعرہ ہیں ان کا یہ پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کی طبع آزمائی کا خاص میدان نظم ہی ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں ہم عصر مسائل کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ شاعرات کے تئیں عام خیال یہ ہے کہ ان کی شاعری کا لب ولہجہ دھیما اور سہما ہوا ہوتا ہے۔ اس کے تہذیبی اور معاشرتی اسباب ہوتے ہیں لیکن یہ کلیتاً درست نہیں ہے۔ ناز فاطمہ نے بھی اس مجموعے میں اس جانب اشارہ کیا

ہے۔" جس معاشرے میں عورت کو ضروریات زندگی اور بنیادی حقوق کے لیے لب کشائی کی اجازت نہ ہو، وہاں دل میں چھپے جذبات کا برملا اظہار شجر ممنوعہ کے مصداق ہے۔ جس معاشرے میں لڑکی ہونا ہی جرم ہو وہاں اوپر سے شاعرہ ہونا ناقابل تلافی جرم۔" یہ معاشرتی جبر ہے جہاں ایک فنکار کو بھی مافی الضمیر کی ادائیگی کے شاعرانہ اظہار کی اجازت نہ ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان میں معاشرتی جبر کے باوجود یہاں خواتین نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے وہ اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور دوسری حقیقت یہ بھی کہ آج پاکستان کے معاشرے میں وہ جبر نہیں جو ایک دو دہائی قبل تھا۔ اس لیے اب نئی نسل میں ایسی شاعرات ابھر کر سامنے آرہی ہیں جن کے یہاں جرأت بھی ہے اور اپنے فن پر اعتماد بھی۔ ناز فاطمہ نے بھی اپنے شاعرانہ اعتماد کا اظہار کیا ہے خواہ وہ انکساری کے لب و لہجے میں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ پیش گفتار میں "مجھے کچھ کہنا ہے" کے عنوان سے لکھتی ہیں "پورے یقین اور مان کے ساتھ جو جیسے دل میں خیال آیا ویسے ہی آپ تک پہنچا دیا بغیر اصلاح بغیر رد و بدل کے بالکل امانتوں کی طرح کیونکہ جذبے خیال کی بڑائی سے بہتر ہوتے ہیں۔" فنکار کا یہ انداز ایک قاری کی حیثیت سے مجھے اچھا لگا کیونکہ اس میں نہ صرف ان کا فن بولتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ادب میں جبری رد و بدل سے کئی دفعہ خیالات مسخ ہو جاتے ہیں۔

ناز کی شاعری میں روح عصر پورے جمال و کمال کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے پاکستانی معاشرے کی بد امنی اور انتشار پر دل کی گہرائیوں سے افسوس ظاہر کیا ہے۔ نظم "اے اللہ یہاں کوئی مسجد لال نہ ہو" اور "لال مسجد" جیسی نظمیں لکھ کر ہم عصر مسائل پر ایک حساس فنکار کی طرح ردعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے:

اے میرے وطن تیرے فراخ سینے پہ/ اک تیر لگا ہے/ شہادت کے بدلے جنت/ زندگی کے بدلے موت کی تجارت کرنے والا/ اپنی زندگی کے بدلے ہزاروں بچوں اور/ عورتوں کی زندگی چکا گیا/ (سیدھے جنت کا سرٹیفکٹ جاری کرنے والا)/ برقعہ اوڑھ کر اپنی جان بچا گیا

اس مجموعے کی پہلی نظم حمد یہ نظم ہے لیکن روایتی انداز سے بالکل الگ ہے۔ اس میں رب قدیر کی قدرت اور رحمت بھی ہے اور بندے کی فریاد بھی اور اس فریاد میں جو زمانے کا کرب ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ "کیسے تیری رحمت کو آزماؤں" ان کی دوسری نظم ہے جس میں خداوند قدوس سے زمانے کی ناسازگاری کا بھی ذکر کرتی ہیں اور دست دعا بھی دراز کرتی ہیں:

میرے خدا/ میں تیری ثنا کیسے پڑھوں/ کہ میری زبان کو کڑوے سچ نے ڈس لیا ہے/ جسم میرا نیل نیل زہر سے بھر گیا ہے/ کہ میں نے دیکھی ہے ایسی بدی/ جو نیکی سے بڑھ چڑھ گئی ہے/ میں نے دیکھے ہیں افغان و عراق/ جو خون میں لت پت پڑے ہیں/ میں نے دیکھے ہیں ایسے بجیر جو تیرا نام سنتے ہی بگڑ گئے ہیں/ اور دیکھے ہیں ایسے بُتش/ جو تیرے دیاروں پہ بارود بن کے برس گئے ہیں/ میرے خدا/ کچھ تو ہی بتا دے کیسے تیری رحمت کو آزماؤں

ناز کی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی کجرویوں کے خلاف احتجاج بھی کرنا چاہتی ہیں، کبھی دبی زبان میں اور کبھی جھنجلاہٹ میں "تماشا ختم کردو تم" جیسی نظمیں بھی لکھتی ہیں اور کبھی گھٹن محسوس کرتے ہوئے "عورت ہونا بھگت رہی ہوں"، "سورج سارا گہنا چکا ہے" جیسی نظمیں بھی تخلیق کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر مشق سخن جاری رہی تو ان کا لب و لہجہ پیشین گوئی کر رہا ہے کہ یہ آواز بہت دور تک جائے گی۔

● فکر فن فنکار

مصنف: حسن مثنیٰ

صفحات: 224، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایلیا پبلی کیشنز، مکتبۂ ایلیا، دہلی-67

مبصر: منتظر قائمی، ستلج ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

سید مثنیٰ حسن رضوی کی تنقیدی تحریروں کا پانچواں مجموعہ "فکر فن فنکار" مختلف عہد کے نامور ادیبوں اور شاعروں کے فکر و فن پر مشتمل مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں پندرہ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون "خطوط غالب میں ان کے عہد کا سیاسی و سماجی کرب" ہے جس میں انھوں نے عہد غالب کے سیاسی و سماجی کرب کو غالب کے خطوط اور ان کی نثری تصانیف کے حوالے سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کا عہد مغلیہ سلطنت کے انحطاط اور 1857 کے بحران سے عبارت ہے۔ دوسرا مضمون "مراثی انیس کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ" جو بیس صفحات پر مشتمل ہے، اس میں انھوں نے میر انیس کو نفسیات انسانی کا ماہر قرار دیا ہے۔ انیس جس دور میں انسانی نفسیات کی گرہیں کھول رہے تھے اس وقت تک نفسیات ایک علم کی شکل میں مرتب نہیں ہو پایا تھا۔ "مراثی دبیر میں فارسی الفاظ و تراکیب" بھی ایک اچھا مضمون ہے جس میں مصنف نے دبیر کے مشہور مرثیوں میں فارسی لفظیات و تراکیب کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

"محبت میں شب تاریک ہجراں..." میں داغ اسکول کے پروردہ بے خود دہلوی کے شاگرد مخمور دہلوی کی شاعری کے بعض پہلوؤں کی بازیافت کی ہے۔ "منٹو: ایک اخلاقی محتسب" میں منٹو کے موضوع اور فن کے حوالے سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ میراجی، بھیشم ساہنی، رفعت سروش اور علی باقر سے متعلق مضامین بھی توجہ سے قلم بند کیے گئے ہیں۔ "کیفی اعظمی: شخص اور شاعر" کے حوالے سے مصنف نے اس ترقی پسند شاعر کی عملی اور ادبی زندگی بالخصوص شاعری کے فنی اور فکری نکات سے آگاہ کرایا ہے اور ان کی شاعری کے رومانی،

انقلابی، احتجاجی، سیاسی اور عوامی پہلو پر بڑے مفصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ سردار جعفری سے متعلق مضمون بھی موصوف نے اسی انداز سے تحریر کیا ہے۔ مضامین میں اعتدال اور توازن ہے۔ تحریر میں کوئی ابہام یا الجھاؤ نہیں ہے۔

● **عکس بصیرت/ مصنف: مطیع اللہ ناز ش**

صفحات: 200، قیمت: 150 روپے

ناشر: آزاد میموریل پبلی کیشنز، D/203، سیکٹر-6، مرکت نگر، سی ڈی اے، کٹک-753001

''عکس بصیرت'' مولوی مطیع اللہ ناز ش کے مضامین کا مجموعہ ہے اس میں 11 مضامین ہیں اور 6 مضامین کتاب اور صاحب کتاب پر بھی شامل ہیں۔ مطیع اللہ ناز ش نے سرسید احمد خاں، فکر تونسوی، قرۃ العین حیدر، مالک رام اور صالحہ عابد حسین کے فکر وفن کا جائزہ لیا ہے تو دوسری طرف کرامت علی کرامت، امجد نجمی، سعید رحمانی اور محبوب محشر وغیرہ پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ کرامت علی کرامت نے عکس بصیرت کے بارے میں لکھا ہے: ''عکس بصیرت کے لیے مولانا مطیع اللہ ناز ش نے صرف دس ایسے مضامین کا انتخاب کیا ہے جن میں سے پانچ مضامین اردو نثر کے عناصر خمسہ پر مشتمل ہیں تو باقی پانچ مضامین اڑیسہ میں اردو تحریک کے موضوع پر خاطر خواہ روشنی ڈالتے ہیں۔''

اس بیان میں اردو نثر کے عناصر خمسہ کی ترکیب محل نظر ہے۔ اردو نثر کے عناصر خمسہ میں سے صرف ایک یعنی سرسید اس کتاب میں جلوہ افروز ہیں۔

● **چہار آئینہ/ شاعر: علقمہ شبلی**

صفحات: 96، قیمت: 125 روپے

ناشر: اثبات ونفی پبلی کیشنز، 5/89، رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کولکاتا-16

علقمہ شبلی اردو کے اہم شاعر ہیں ان کی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں چار شعری مجموعے ہیں ایک سفرنامۂ حج اور کچھ بچوں کی نظموں کے مجموعے۔ ان کی رباعیوں کے اس مجموعے کو عاصم شہواز شبلی نے ترتیب دیا ہے، جو علقمہ شبلی کے صاحبزادے بھی ہیں اور خود ایک شاعر بھی۔

علقمہ شبلی کا شمار شہر کولکاتا کے استاد شاعروں میں ہوتا ہے۔ رباعی کا فن لمبی ریاضت چاہتا ہے اور علقمہ شبلی اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے ناوک حمزہ پوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''علقمہ شبلی اپنے معاصرین رباعی گو شعرا کی صف میں نہایت اہم اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔''

● **سرمایۂ ادب/ مرتب: ڈاکٹر محمد نعمان خاں**

صفحات: 240، قیمت: 250 روپے

ناشر: دبستان بھوپال، زیب ولا، A-79، کٹوری بھوپال

اردو میں اشاریہ سازی کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن اردو میں کچھ بہت عمدہ اشاریے تیار کیے گیے ہیں مثلاً ڈاکٹر عطا خورشید نے قاضی عبد الودود اور مختار الدین آرزو کی تحریروں کا جو اشاریہ تیار کیا ہے وہ اتنا عمدہ ہے کہ ڈاکٹر محمد نعمان خاں اس کو سامنے رکھتے تو اس اشاریے کی شکل دوسری ہوتی۔ ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے پروفیسر عبد القوی دسنوی کی مطبوعات کا اشاریہ تیار کیا ہے۔ اس میں سرگذشت کے عنوان سے عبد القوی دسنوی کی داستان حیات شامل ہے۔ اس کے بعد ان کی تحریروں کا اشاریہ ہے جو 39 صفحات کو محیط ہے۔ اس کے بعد 184 صفحات پر وہ تبصرے ہیں جو عبد القوی دسنوی کی کتابوں پر مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح سرمایۂ ادب سے اردو کی ایک فعال اور متحرک شخصیت کے تمام کارناموں پر روشنی پڑتی ہے جو مختلف رسائل وجرائد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

● **اردو شاعری اور قومی یکجہتی/ مرتب: ڈاکٹر بانو سرتاج**

صفحات: 152، قیمت: 150 روپے

ناشر: پہچان پبلی کیشنز، 1۔، برن تلہ، الہٰ آباد-211003 (یو. پی.)

اردو میں قومی شاعری کی روایت خاصی قدیم ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو نے دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے جس کی بہت سی سیاسی اور سماجی وجوہات ہیں جن پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں پر یہ عرض کرنا ہے کہ اردو میں قومی شاعری کی روایت بہت مضبوط رہی ہے اور اس کا جائزہ بھی مختلف سطحوں پر لیا جاتا رہا ہے مثلاً علی جواد زیدی کی کتاب ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال'' اور جاں نثار اختر کی ''ہندوستان ہمارا'' وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک نئی کتاب ڈاکٹر بانو سرتاج کی ''اردو شاعری اور قومی یکجہتی'' ہے۔ یہ کتاب دس ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے ''اردو کے غیر مسلم شعرا کا نعتیہ کلام''، دوسرا باب ''اردو شاعری میں شری رام'' اور تیسرا ''اردو شاعری اور ہولی'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ ان ابواب سے اردو کا سیکولر کردار ظاہر ہوتا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان مصنفہ نے ''اردو شاعری میں عید کی مٹھاس'' رکھا ہے۔ پانچویں باب کا ''اردو شاعری میں گرونانک'' اور چھٹے باب کا عنوان ''اردو شاعری میں شری کرشن'' رکھا ہے جبکہ ساتویں باب کی سرخی ''اردو کے عیسائی شاعر'' ہے۔ آٹھواں باب ''اردو شاعری میں دیوالی کی جگمگاہٹ'' اور نواں باب ''قومی یکجہتی اور اردو شاعری'' کے عنوان سے ہے۔ جب کہ دسواں باب ''اردو شاعری اور شریمد بھگوت گیتا'' ہے۔ اس طرح یہ کتاب اردو شاعری میں مختلف مذاہب کے رنگوں کو ظاہر کرتی ہے اور امید ہے کہ پسند کی جائے گی۔

(ادارہ)

□□□

ارشد عبدالحمید

کمپیوٹر

ڈبے جیسا رکھا ہوا — ٹیبل پر ہے سجا ہوا
ٹی وی سے بھی بڑھ کر ہے — یہ میرا کمپیوٹر ہے
نقشہ اس سے بنوا لو — باجا اس سے بجوا لو
کھیلوں کا بھی راجا ہے — اس کو حساب بھی آتا ہے
انگریزی، جاپانی میں — اردو، راجستھانی میں
ہر بھاشا میں کام کرے — ہر بندے کو رام کرے
اس کے بہت سے حصے ہیں — خانے ہیں، کل پرزے ہیں
پھولوں سا غباروں سا — روشن چاند ستاروں سا
شیشے کا جو پردا ہے — مانیٹر کہلاتا ہے
مانیٹر پر تصویریں — بھانت بھانت کی تحریریں
آتی جاتی رہتی ہیں — من بہلاتی رہتی ہیں
اور اُدھر جو تختہ ہے — حرفوں کا گلدستہ ہے
کی بورڈ اس کو کہتے ہیں — ٹائپ اس سے کرتے ہیں
یہ جو بٹن ہیں لگے ہوئے — حرف ہیں ان پر لکھے ہوئے
جس اکشر کا بٹن دبا — وہ پردے پر اُبھر گیا
اکشر مل کر لفظ بنے — لفظوں سے فقرے، جملے
ان جملوں کو جب چاہیں — کاغذ پر لا سکتے ہیں
وہ جو مشین ہے چھاپے کی — پل میں چھاپ کے رکھ دے گی
اور یہ دُم سے بندھا ہوا — چوہے جیسا پڑا ہوا
ننھا سا پھرتیلا ہے — پر ماؤس کہلاتا ہے
اس ماؤس سے جو چاہو — مانیٹر پر بنوا لو
بکسا ہے ایک اور اُدھر — کام میں جیسے جادوگر
معلومات کی کان ہے یہ — کمپیوٹر کی جان ہے یہ
نام ہی لینا چاہو تو — سی پی یو کہہ سکتے ہو
اس کا ایک دماغ بھی ہے — یادوں کا اک باغ بھی ہے
یاد نہیں کھوتی اس سے — بھول نہیں ہوتی اس سے
جو کچھ یاد کراؤ گے — سب واپس پا جاؤ گے

یوں ہی نہیں ہے نام بڑا
کرتا ہے یہ کام بڑا

پتہ:
Ahmad Villa, Kali Pattan, Tonk,
Rajasthan

نذیر احمد یوسفی

چھتری کی قیمت

مولوی غلام فرقت پچاس سال کے ہو چکے تھے، رنگ سانولا، قد چھوٹا، جسم دبلا اور کمزور تھا، سر کے لمبے سفید بال کندھوں تک جھولتے تھے، چہرے پر مختصر سی داڑھی بھی تھی، سر پر ٹوپی رہتی تھی۔ ایک مقامی مدرسے میں بچوں کو پڑھاتے تھے، آدمی بڑے سیدھے سادے تھے، ہر ایک کی بات سننے اور ہر ایک کی بات ماننے والے۔

گھر کی ضرورتوں کا خیال رہتا تھا، اس لیے ہاتھ میں ہمیشہ کالے کپڑے کا پرانا سا جھولا دبائے پھرتے تھے، مدرسہ ہو بازار ہو یا کہیں جا رہے ہوں، جھولا ان کی بغل میں ضرور ہوتا تھا۔ ان کے لیے بے تکلف دوستوں نے کئی مرتبہ ٹوکا بھی کہ اسے کیوں لیے پھرتے ہیں جب کہ عموماً یہ خالی ہی رہتا ہے، لیکن وہ آخر ہنس کر بات ٹال جاتے اور کبھی ''سبزی لینے نکلا ہوں'' کہہ کر مخاطب کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔ آہستہ آہستہ اس جھولے نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ بعض لوگ جھولے والے مولوی صاحب کہہ کر انھیں مخاطب کرنے لگے تھے۔

ساون کا مہینہ سر پر آ چکا تھا، برسات کی رم جھم نے پریشان کر دیا تھا۔ پانی سے بچنے کے لیے جھولا سر پر رکھ کر چلنا برا لگتا تھا، ضرورت چھتری کی تھی۔ یہ بارش عین سودا سلف کو نکلنے، مدرسے یا نماز کے لیے مسجد جاتے وقت ہی کیوں نازل ہو جاتی ہے، مولوی غلام فرقت پر تین دنوں سے یہی جھنجھلاہٹ سوار تھی۔ کمزور جسم کو پانی سے کتنا بھیگنے دیا جائے، کپڑوں کے بار بار بھیگنے سے نزلہ، زکام اور کھانسی کی تحریک سے الگ پریشانی تھی، موقعہ بے موقعہ کھانسی کی کھوں کھوں اور نزلے کی چھیں آچھیں سے طبیعت اکتائی ہوئی تو تھی ہی، اب تو ناک سے پانی کا نالہ بھی بہنے لگا تھا۔

کئی دنوں تک سوچنے اور بیگم کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ آئندہ وہ چھتری کی حفاظت کا پورا خیال رکھیں گے اور کہیں بھی ہاتھ سے نہیں رکھیں گے کہ کھو جانے کا ڈر ہو، ایک کم دام کی چھتری، کام چلاؤ قسم کی بازار سے خریدنے کا فیصلہ کیا۔

مولوی صاحب چھتری خریدنے کو تیار تو ہو گئے لیکن یہ خدشہ جان کو کھاتا رہا کہ کہیں یہ بھی پچھلے موسم کی چھتری کی طرح کھو نہ جائے جسے لے کر وہ کسی ضرورت کے لیے گھر سے باہر نکلے تھے۔ بارش راستے ہی میں تھم گئی تھی، اس لیے وہ کہیں چھوڑ آئے۔ یہ چھتری بھی عجیب چیز ہے کہ کہیں نہ کہیں ضرور چھوٹ جائے گی اور وہ لوگ بھی عجیب ہیں جو دوسروں کی گم شدہ چھتری اپنی سمجھ کر دھڑلے سے استعمال کرتے ہیں مال مفت دل بے رحم، شان سے لیے پھر رہے ہیں دوسروں کی چھتری۔

بازار سے چھتری آئی تو بیگم نے سختی سے کہا:

''دیکھیے اسے بھی کہیں مت بھول آئیے گا، ورنہ اور پیسے میں دینے سے رہی، ساری برسات بھیگ کر کاٹیے گا۔''

مولوی صاحب نے کھسیاہٹ سے کہا:

''میں کیا جان بوجھ کر بھول آتا ہوں۔ یہ کم بخت چیز ہی ایسی ہے کہ کسی ایک کی بغل میں رہنا نہیں چاہتی، گھر بدلنے میں ماہر ہے۔''

مولوی صاحب بیگم کی جھنجھلاہٹ کو جائز سمجھ رہے تھے، نئی چھتری خریدنے میں پیسے بھی تو لگتے ہیں، خرچ کر کے کوئی چیز گھر میں آئے اور دوسرے

تیسرے دن ہی کسی اور گھر میں منتقل ہو جائے تو دکھ تو ہوگا۔

پچھلی چھتری کے کھو جانے کا غم مولوی صاحب کو بھی تھا، اسی لیے نئی چھتری کو جان سے لگائے رہتے تھے، نہ کہیں ہاتھ سے رکھیں گے نہ بھولیں گے۔ لیکن جانے والی چیز کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتی ہے۔ کل ہی سبزی والے کے یہاں سبزی جھولے میں ڈالتے وقت چھتری دکان ہی پر چھوڑ کر آگے بڑھ آئے تھے، وہ تو دو قدم پر ہی چھتری کی محبت نے جوش مارا، جھپٹ کر سینے سے لگا لیا خدانخواستہ دس قدم بڑھتے پر تو چھتری گئی تھی، کیونکہ یہ تو ہر ایک کے کام آنے والی شے ہے۔

زندگی میں اب تک تین چھتریوں کے کھو جانے کا غم اکثر مولوی صاحب کی آنکھوں کی نیند اڑا دیتا تھا۔ وہ لمحات کتنے صبر آزما ہوتے تھے، جب نئی اور جوان چھتری ہاتھوں سے پھسل کر کسی اور کی بغل میں جا سمٹتی تھی اور ان کے دل و دماغ کو پراگندہ کر کے چھوڑ جاتی تھی۔ بیگم کے طعنے الگ دل چھلنی کرتے رہتے تھے۔ برسات کے کئی موسم تو انھوں نے بغیر چھتری کے ہی رومال اور تولیے کی مدد سے گزار دیے۔ مگر یہ انھیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ سر پر تولیہ ڈال کر چلتے دیکھ کبھی کبھی گلیوں کے آوارہ لڑکے تالیاں بجانے لگتے تھے اور ان کو سوائے غصہ چبا جانے کے اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے مولوی غلام فرقت کو خیال آیا کہ کہیں چھوڑ کر آجانے سے چھتری واپس نہیں آتی تو قصور اپنا ہی ہے۔ جب چھتری پر مالک کا نام اور پتہ درج نہ ہو تو پانے والا واپس کرنے کہاں جائے۔ کیوں نہ نئی چھتری پر اپنا نام اور پتہ لکھ دیا جائے، تاکہ کسی بھلے آدمی کے ہاتھ لگے تو وہ واپس کر جائے، ساڑھے تین روپئے کے قلمی برش کی مدد سے انھوں نے چھتری کے پیٹ میں لکھا'' مجھے چھتری بھول جانے کی عادت ہے، آپ کو ملے تو نیچے کے پتے پر پہنچا دیں، نہیں تو تیس روپئے کا منی آرڈر کر دیں، شکریہ۔'' بیگم نے دیکھا تو پیشانی پر ہاتھ مار کر بولیں۔ ''اللہ! آپ کی عقل کو کیا ہو گیا ہے، سو روپئے کی چھتری کے تیس روپئے اور کھوئی ہوئی چھتری کے دام بھی کوئی دیتا ہے بھلا؟'' مولوی صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر فرمایا۔'' کیا کروں! کئی چھتریاں چلی گئیں، اگر اس چھتری کے صرف تیس روپئے ہی واپس آجائیں تو اللہ کا شکر ادا کروں گا۔''

مولوی غلام فرقت نئی نویلی چھتری کی نگہداشت اتنی سختی سے کر رہے تھے جیسے کوئی اکلوتی اولاد کو آوارگی سے بچائے رکھنے پر توجہ صرف کرتا ہے۔ مگر کم بخت نئی چھتری بھی غضب کی عیار نکلی، ایک دن، ان کے ہاتھ سے پھسل ہی گئی، پورے گھر میں کئی دنوں تک ماتم کی سی کیفیت رہی جیسے کسی کی موت واقع ہو گئی ہو۔ ساتویں دن ڈاکیہ تیس روپئے کا منی آرڈر دے گیا، دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے تو بات سمجھ میں آئی کہ نئی چھتری کسی کو مل گئی ہے اور اس نے تیس روپئے بھیجے ہیں۔ ساتویں دن پھر تیس روپئے آئے تو حیرانی ہوئی کہ یہ کس لیے۔

منی آرڈر کا سلسلہ تا دم تحریر جاری ہے، لگتا ہے اس چھتری کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانے تک تیس روپئے کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ بیگم نے مولوی صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ کیوں نہ اسی طرح کی تحریر کے ساتھ کچھ اور چھتریاں بھی مارکیٹ میں چھوڑی جائیں تاکہ منی آرڈروں کا سلسلہ بند نہ ہو۔

☐☐☐

Urdu Darbar
Rahmania School Street, Asansol (W.B.) 713302

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اوّل)

مؤلف: پروفیسر محمد انصاراللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال وکوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اوران کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصاراللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

''بحر الفصاحت''، نظم ونثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت 1-/52 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی وادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ''کلیات علی سردار جعفری'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' اور دوسری جلد میں ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر''، ''لہو پکارتا ہے'' اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات: 496، قیمت -/164 روپے، جلد دوم: صفحات: 533، قیمت -/200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش روؤں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ ''کلیات حسن نعیم'' میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم ''کوشش'' کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم ''ہیپی نیس آف اس الون'' پر مبنی ہے جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت -/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ ''میرے اپنے''، مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم ''اپن جن'' کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت -/63 روپے

Date of Publication : 24/08/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, September 2008, Vol. 10, Issue: 9
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے
اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	[illegible]
بنگلہ دیش	148 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and
printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938